Regd. No. 5400

NAURОZ

Urdu Weekly

Vol. 1 | Sunday 4th Sept 1949 | No. 9

مطبوعہ [illegible] قومی پریس بنگلور

از ایاٹ آیٹکنس

برطانوی پارلیمنٹری طرزِ حکومت

برطانوی طرزِ حکومت دُنیا میں سب سے پرانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ کو دنیا کی پارلیمنٹوں کی ماں کہا جاتا ہے۔ یہ طرزِ حکومت اب دُنیا کے گوشے گوشے میں پھیل رہا ہے۔ برطانیہ دُنیا میں سب سے پہلا ملک ہے، جس نے شخصی حکومت کا خاتمہ کیا۔ اور پارلیمنٹری طرزِ حکومت کی بنیاد رکھی۔ ایک زمانہ تھا جب برطانیہ کا بادشاہ تمام اختیارات کا مالک تھا۔ اور وہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا تھا۔ وہ اصلی معنوں میں ملک کا حاکم تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ قانون کا کام دیتا تھا۔ اب تمام اختیارات بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر کیبنٹ اور پارلیمنٹ کے ہاتھ میں آگئے ہیں۔

وزارت کا انتخاب

پارلیمنٹری طرزِ حکومت میں ایوانِ عام کی اکثریت والی پارٹی میں سے وزارت کا انتخاب ہوتا ہے۔ پارٹی کا لیڈر وزیراعظم کے عہدے پر مقرر کیا جاتا ہے۔ وزیراعظم اپنی مرضی کے مطابق دوسرے وزیروں کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر وزارت کے خلاف عدمِ اعتماد کا ووٹ پاس ہو جائے تو وزیراعظم عام انتخابات میں اس کی پارٹی کو شکست حاصل ہو تو اس کی حکومت کو استعفےٰ دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ تاج کو نئے وزیراعظم کے انتخاب کے متعلق مشورہ دیتا ہے۔

وزیراعظم کی سرکاری قیام گاہ (۱۰) ڈاؤننگ سٹریٹ ہے۔ اس کے دروازے پر تانبے کی ایک پلیٹ لگی ہوئی ہے، جس میں فرسٹ لارڈ آف ٹریژری کے الفاظ کندہ ہیں۔ یہ وزیراعظم کا سرکاری لقب ہے۔ وزیراعظم کا لقب ایک سرکاری اختراع ہے۔

ایوانِ اُمراء اور وزیراعظم

زمانۂ گذشتہ میں ایوانِ اُمراء کا رکن بھی برطانیہ کا وزیراعظم بن سکتا تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض وزرائے اعظم جو ایوانِ اُمراء سے لئے گئے تھے، بہت کامیاب ثابت ہوئے، اور انہوں نے ملک کی سیاسی زندگی پر بہت گہرا نقش بٹھایا۔ لیکن اب سوچنا بھی غلطی ہے کہ ایوانِ اُمراء کا ممبر برطانیہ کا وزیراعظم بھی بن سکتا ہے۔ ایوانِ عام یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ دوسرے ایوان کا ممبر جس پر وہ پوری طرح کنٹرول نہ رکھ سکے، اور جس کو وہ مکمل طور پر اپنے ڈسپلن میں نہ رکھ سکے، برطانیہ کا وزیراعظم ہو۔

ایوانِ عام کا لیڈر

اس وقت مسٹر ایٹلی برطانیہ کے وزیراعظم ہیں۔ اور مسٹر موریسن نائب وزیراعظم۔ کیبنٹ ممبر کی حیثیت سے مسٹر ہربرٹ موریسن کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ ایوانِ عام کے لیڈر ہیں۔ ایوانِ عام میں ان کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ ایوان کے سامنے حکومت کا جو بل پیش کرتی ہے ان کو کامیابی کی راہ پر لے جانے کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔

کچھ سال پہلے عام طور پر وزیراعظم ہی ایوانِ عام کا لیڈر ہوتا تھا۔ اور یہ بات تھی بھی مناسب۔ کیونکہ پارلیمنٹری طرزِ حکومت میں یہ لازمی ہے کہ حکومت اور خاص کر وزیراعظم کو ایوانِ عام کا اعتماد حاصل ہو۔ اگر وزیراعظم اپنی حکومت کو برسرِ اقتدار رکھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایوانِ عام کے ممبروں کی رہنمائی اور ان کا اعتماد حاصل کرے۔

لیکن چند سالوں سے حکومت کے کام میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ ایک آدمی دو عہدے نہیں سنبھال سکتا۔ وزیراعظم کو اپنے دفتر اور کیبنٹ کے جلسوں میں اتنا کام کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایوانِ عام کی بحثوں میں پوری طرح حصہ نہیں لے سکتا۔

اب یہ ایک قسم کا رواج ہو گیا ہے کہ کیبنٹ کا سینئر وزیر ایوانِ عام کا لیڈر ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وزیراعظم ایوانِ عام کی بحثوں کے وقت وزیراعظم کی ایوانِ عام میں موجودگی نہایت لازمی ہے۔ یہی موقع ہے جب وزیراعظم ملک کے سیاسی رجحانات کا اندازہ لگا اور اپنی پالیسی کو ان کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ حکومت اور مخالف پارٹی کی سیاسی جھڑپیں ایسے موقعوں پر بہت دلچسپ اور اہم ہوتی ہیں۔

نائب وزیراعظم

مسٹر ایٹلی کی غیر حاضری میں مسٹر موریسن کو نائب وزیراعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اصل میں ان کا سرکاری لقب ’لارڈ پریذیڈنٹ آف دی کونسل‘ ہے۔ برطانیہ کی سیاسی زندگی میں نائب وزیراعظم کا لقب بالکل نیا ہے۔ یہ لقب سب سے پہلے مسٹر ایٹلی کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ مسٹر چرچل جو دورانِ جنگ میں برطانیہ کے وزیراعظم تھے، اوقیانوسی چارٹر مرتب کرنے کے سلسلے میں پریذیڈنٹ روزویلٹ سے ملنے برطانیہ سے باہر گئے ہوئے تھے۔ مسٹر ایٹلی مسٹر چرچل کی غیر حاضری میں وزارت کے سب سے بڑے رکن تھے۔ چارٹر کا اعلان کرنے کے لئے وہ بی۔ بی۔ سی کے مائیکروفون پر آئے۔ اس وقت ان کو نائب وزیراعظم کے نام سے مخاطب کیا گیا۔ اس وقت سے برطانیہ میں یہ چھوٹی سی اختراع چلی آتی ہے۔

مگر اس میں کوئی [illegible] ہے کہ [illegible] سے پار کرنے کی [illegible] نائب وزیراعظم [illegible] میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔

وزیرِ خارجہ

آئین کے مطابق وزیرِ خارجہ کی غیر حاضری میں صرف وزیراعظم ہی قائم مقام وزیرِ خارجہ بن سکتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امن اور جنگ کے زمانے میں ملک کی خارجی پالیسی کی آخری ذمہ داری وزیراعظم کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پارلیمنٹ سے باہر بعض ضروری موقعوں پر وزیراعظم خارجی پالیسی کے متعلق تقریر کرتا ہے۔

غزل

از جناب افتخار احمد مبشر قریشی

ہوا اس شان سے میری وفا کا امتحاں یوں
زمیں کا ذرہ ذرہ رہ چکا ہے آسماں یوں

نہ ہو محسوس اب انکو مگر پہلے یہ عالم تھا
انہیں بیتاب کرتی تھیں مری بیتابیاں یوں

کسی کی کم نگاہی نے بنایا اس کو فریادی
وگرنہ بے نیازِ نطق تھی میری زباں برسوں

بسر دنیا میں کیونکر کی اٹھایا بارِ غم کیونکر
تمہارے غم سے پوچھو وہ رہا ہے رازداں یوں

ترے بیمار نے دو ہچکیوں میں ختم کی آخر
وہ شرحِ زندگی جو ہو نہ سکتی تھی بیاں یوں

گلہ تجھ سے کرے وہ کیا تری بے التفاتی کا
جو اپنے حال پر خود ہی رہے نامہرباں یوں

خبر کیا ہمکو فصلِ گل میں کیا ہوتا ہے گلشن میں
مقدر میں ہمارے تو رہیں ویرانیاں برسوں

جہاں راہِ محبت میں پڑا ہے اک قدم اپنا
وہ نقشِ پا رہیگا سجدہ گاہِ قدسیاں یوں

بہا ہو اشکِ حسرت کا کیا وہ رازِ عشق افشا
جسے رکھا تھا ہم نے اپنے سینے میں نہاں یوں

یونہی قائم رہیگا مہر و الفت کا نشاں بن کر
تمہارے آستاں پر میرے سجدے کا نشاں یوں

دعائے بے اثر اکثر رلاتی ہی ہمکو
مبشر ہم تو کرتے ہی رہے آہ و فغاں یوں

مشرقِ وسطیٰ اور اس کے مسائل

وسعت اور آبادی پر نظر ڈالنے کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے قدرتی ذخائر اور وسائل نیز پیداوار کا جائزہ لیجئے، تو حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:-

زرعی پیداوار خصوصاً غلہ کے اعتبار سے مشرقِ وسطیٰ کا ہر ملک سوائے عرب کے مکتفی ہے۔ ترکی اور پاکستان سے گیہوں، مصر سے چاول ہر سال برآمد کئے جاتے ہیں۔ اس فاضل پیداوار سے عرب کی ضروریات بخوبی پوری ہو سکتی ہیں علاوہ ازیں مشرقِ وسطیٰ میں زراعت کی توسیع دینے کے لامحدود امکانات ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

روئی مشرقِ وسطیٰ کی سب سے قیمتی زرعی پیداوار ہے۔ اور قریب قریب ہر ملک میں بافراط ہوتی ہے۔ مصر اور پاکستان خاص طور پر کثرت پیداوار اور اچھی روئی کی وجہ سے مشہور ہیں، دنیا میں لمبے ریشے کی روئی کی پیداوار کا [illegible] فی صدی حصہ مصر میں ہوتا ہے۔

ترکی تمباکو ساری دنیا میں مشہور ہے اور ملک کی آمدنی اور خوشحالی کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، مصر، ایران اور پاکستان میں بھی تمباکو کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔

پھل اور میووں کی پیداوار میں مشرقِ وسطیٰ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اور یہ کثیر تعداد میں دوسرے ملکوں کو بھیجے جاتے ہیں۔

اون بہترین قسم کا اور بکثرت ہوتا ہے، جس کی وجہ سے یہاں قالین سازی کی صنعت عام ہے۔

چائے اور چمڑے کی تمام ضروریات صرف پاکستان، پوری کر سکتا ہے، پاکستان کی وجہ سے پٹ سن کی عالمگیر اجارہ داری بھی مشرقِ وسطیٰ کے پاس آ جائے گی۔

معدنیات!

یہ تو ہے زرعی پیداوار کا حال، معدنی پیداوار میں مشرقِ وسطیٰ اس سے بھی زیادہ خوش قسمت ہے پیٹرولیم جو اس دور میں صنعتی ترقی کی بنیاد ہے، امریکہ کے بعد سب سے زیادہ مشرقِ وسطیٰ میں نکالا جاتا ہے۔ پیٹرولیم کے جو محفوظ ذخیرے ہیں، ان کی وسعت کی بنا پر یہ اندازہ لگایا جاتا ہے۔ کہ آئندہ چند سالوں میں مشرقِ وسطیٰ پیٹرولیم کی پیداوار کا دنیا میں سب سے بڑا مرکز بن جائے گا۔

کوئلہ ترکی میں بہت نکلتا ہے، تھوڑی مقدار میں پاکستان اور ایران میں بھی نکالا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک ذخائر کا تعلق ہے۔ افغانستان، ایران اور ترکی میں یہ ذخائر لامحدود ہیں۔

لوہا صرف ترکی میں معقول تعداد میں نکالا جاتا ہے۔ لبنان اور مصر میں تھوڑی مقدار میں نکلتا ہے۔ لیکن ان ملکوں میں، خصوصاً افغانستان اور ایران میں لوہے کے ذخائر بہت ہیں مینگنیز کا جو فولاد بنانے کے کام آتا ہے، سوائے عرب کے قریب قریب ہر ملک میں پتہ لگ چکا ہے۔ ترکی اور مصر میں نکالا بھی جاتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں ریلوں اور سڑکوں کا انتظام نیز تار اور ٹیلیفون کا انتظام قابلِ اطمینان قرار دیا جا سکتا ہے گو یہ کمی بھی تھوڑی نہیں ہے کہ بغداد اور دمشق کے درمیان براہ راست ریلوے لائن نہیں ہے، ایران سے عراق اگرچہ ملا ہوا ہے، لیکن دونوں ملکوں کو ملانے کیلئے ریل کا سلسلہ موجود نہیں ہے۔

طہران سے تبریز جانے والی ریلوے لائن ابھی تک نامکمل ہے۔ لیکن اس کی تکمیل کے بعد بھی ایران اور ترکی کے درمیان ریل کا براہ راست تعلق نہیں ہو سکتا، اور طہران سے انقرہ جانے کیلئے سوویٹ یونین سے گذرنا پڑے گا یہی مشکل پاکستان اور ایران کے درمیان حائل ہے۔ ہمارے ریلوے نظام سے ایرانی ریلوے نظام کا کوئی تعلق نہیں، اگر زاہدان سے مشہد اور تبریز تک ریلوے لائن ڈال دی جائے تو نہ صرف کراچی اور طہران کے درمیان ریل کے ذریعہ آمد و رفت عام ہو جائے گی۔ بلکہ ہم کراچی سے قاہرہ اور استنبول تک آسانی سے سفر کر سکیں گے۔ دمشق سے مکہ معظمہ تک ریلوے لائن کی تعمیر بھی بہت ضروری ہے۔ اس طرح زمانہ حج میں حاجیوں کے لئے سہولت ہو جائے گی، اور ایک دور افتادہ ملک باقی اسلامی ملکوں سے قریب تر ہو جائے گا۔

صنعت و حرفت!

صنعتی حیثیت سے سوائے ترکی کے تمام ملک پسماندہ ہیں، افغانستان، عرب، عراق اور شام میں صنعت نہ ہونے کے برابر ہے، ترکی میں کپڑے کی ہر قسم ضرورت مقامی کارخانے پوری کر دیتے ہیں۔ اور روئی کی تمام پیداوار ان کارخانوں میں صرف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شکر کے کارخانے ملکی ضرورت کے لئے کافی ہیں، معدنیات کافی نکالی جاتی ہیں۔ فولاد اور تانبے کی صنعت ترقی پر ہے، اسلحہ سازی کے کارخانے کافی تعداد میں ہیں۔ اور کاغذ سازی کی صنعت ابھی حالت [illegible] میں ہے۔

مصر میں کپڑے کے کارخانے ملک کی صرف نصف ضرورت پوری کرتے ہیں۔ ان کارخانوں میں روئی کی کل پیداوار کا [illegible] فی صدی حصہ صرف ہوتا ہے، باقی روئی برآمد کی جاتی ہے شکر ملک کی ضرورت کے لئے کافی تیار ہوتی ہے۔ سیمنٹ، بجلی اور سگریٹ کی صنعتیں بھی ملکی ضرورت پوری کر دیتی ہیں۔ شام میں کافی سیمنٹ بنتا ہے۔

پیٹرولیم کی صنعت مشرقِ وسطیٰ کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ لیکن تمام کی تمام امریکہ اور برطانیہ کے سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہے۔ کرومیم بھی فولاد سازی کے کام آتا ہے، کرومیم کی پیداوار میں ترکی کا دنیا میں [illegible] ہے پاکستان میں بھی تقریباً بیس ہزار ٹن کرومیم ہر سال نکالا جاتا ہے۔ شام اور ایران میں بھی اس کے ذخائر کا پتہ چلا ہے۔

تانبا ترکی میں کثیر تعداد میں نکلتا ہے اور بیشتر ملکوں میں اس کے ذخائر ہیں۔

مذکورہ بالا معدنی پیداوار کے علاوہ سیسہ، جست سرمہ، گندھک، اور دیگر معدنیات یا تو مشرقِ وسطیٰ میں نکالی جاتی ہیں۔ یا ان کے ذخائر موجود ہیں، رضا شاہ مرحوم نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا، کہ ایران میں معدنی پیداوار کی وہ کثرت ہے کہ یہ ملک دوسرا امریکہ بن سکتا ہے۔ آپ کے یہ الفاظ کسی مبالغہ پر مبنی نہیں۔ البتہ ان میں اتنا اضافہ اور کیا جا سکتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر ملک معدنی ذخائر میں ایران سے کم نہیں ہیں، ضرورت صرف اس کی ہے۔ [illegible]

انتہا ہے کہ یہ جلد جلد حل کی جائے ۔

تعلیم!

یہ تو تھا مشرق وسطیٰ کا روشن پہلو، اب تاریک پہلو بھی ایک نظر دیکھئے، تمام مشرق وسطیٰ میں سوائے لبنان کے جہاں تعلیم یافتہ باشندوں کی تعداد ۶۰ فی صدی ہے۔ جہالت اور ناخواندگی عام ہے۔ ترکی اور مصر جو دنیائے اسلام میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں بھی خواندگی کا تناسب بالترتیب ۲۵ فی صدی اور ۱۵ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے۔ دیگر ملکوں کے متعلق تو کچھ کہنا بیکار ہے

اعلیٰ تعلیم کا البتہ معقول انتظام ہے۔ لیکن ایران اور عراق اس میں بھی بہت پست ہیں، افغانستان اور عرب کا تو ذکر ہی کیا، پورے مشرق وسطیٰ میں صرف ایک "جامعۂ ازہر" ایسا ادارہ ہے جہاں اعلیٰ دینی تعلیم دی جاتی ہے، اٹھارہ کروڑ انسانوں میں دنیوی تعلیم کی صرف ایک یونیورسٹی کس قدر افسوسناک بات ہے

رسل و رسائل!

ملکی ترقی میں رسل و رسائل کی حیثیت بنیادی ہے۔ لیکن عرب اور افغانستان میں ریلوے کی ایک لائن بھی نہیں ایران میں ضرور دو ہزار میل کے قریب طویل ریلوے لائن موجود ہے، لیکن اس قدر وسیع تر نہیں ہے، نتیجہ یہ ہے کہ بیرونی ممالک زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور تیل پیدا کرنے والے ملکوں کو پورا فائدہ نہیں پہنچتا، علاوہ ازیں تیل کی یہ اجارہ داریاں غیر ملکوں کی سیاسی مداخلت اور اثرات کا باعث ہو رہی ہیں۔

مشرق وسطیٰ کے ملکوں کا سیاسی اور معاشی نظام بھی بہت ہی ناقص ہے، جمہوری طرز حکومت صحیح معنوں میں صرف ترکی، شام اور لبنان میں قائم ہے، مصر اور عراق کے جمہوری ملک نہیں کہے جا سکتے، افغانستان، شرق اردن اور عرب کی حکومتیں تو ہر اعتبار سے شخصی بادشاہتیں ہیں۔

نظام زرعی وہی پرانے طرز کا ہے۔ جاگیرداریاں تمام مشرق وسطیٰ میں عام ہیں، طریقۂ کاشت عام نہیں ہوا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ بیشتر ملکوں کیلئے باعث تشویش بن گیا ہے۔ مصر میں قابل کاشت زمین بہت کم ہے، آبادی کی زیادتی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں فی مربع میل ڈیڑھ ہزار انسان بستے ہیں، دنیا کے کسی ملک میں آبادی اتنی گنجان نہیں ہے۔

لبنان میں کثرت آبادی کی وجہ سے عیسائی باشندے امریکہ اور مسلمان، شام چلے جاتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی آبادی بڑھنے کی رفتار تیز ہے، اگر ان ملکوں کے زرعی نظام میں اصلاح ہو جائے۔ اور جدید طریقۂ کاشت کو رواج دیا جائے۔ تو پیداوار بہت بڑھائی جا سکتی ہے۔

مختلف ملکوں میں قابل کاشت اور زیر کاشت زمین کا اندازہ حسب ذیل ہے:-

ملک	قابل کاشت رقبہ	زیر کاشت رقبہ
ترکی	۳ لاکھ مربع کلومیٹر	۴۵ ہزار کلومیٹر
مصر	۳۴ ہزار " "	۲۴ " "
شام و لبنان	۶۱ " "	۱۸ " " "
عراق	۴۴ " "	۱۳ " "

مذکورہ بالا اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی شام اور عراق میں قابل کاشت اراضی کا بہت ہی محدود حصہ زیر کاشت لایا گیا ہے۔ اگر یہ بیکار زمینیں بھی زیر کاشت لے آئی جائیں تو مشرق وسطیٰ کی زرعی پیداوار کئی گنا زیادہ ہو جائے، اور یہ ممالک دنیا کو اسی طرح غلہ برآمد کرنے لگیں جس طرح آج کناڈا اور آسٹریلیا وغیرہ برآمد کر رہے ہیں۔

مشترک مسائل!

یہ ہے مشرق وسطیٰ اور اس کے مسائل کا مختصر خاکہ، چند باتیں واضح ہیں، ایک وہ یہ کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک تعلیمی، سیاسی، اور معاشی حیثیت سے ابھی بہت پست ہیں، سب کی اقتصادیات زرعی ہیں۔ صنعتی ترقی کے بے شمار امکانات موجود ہیں۔ مختصراً یوں کہئے کہ مشرق وسطیٰ کے مسائل یکساں قسم کے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے تعاون سے ان مسائل کو حل کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ چنانچہ مشرق وسطیٰ کے مسائل کی اسی یکسانیت کی وجہ سے اقوام متحدہ نے مشرق وسطیٰ کے لئے ایک اقتصادی کمیشن قائم کیا ہے۔ غالباً مشرق وسطیٰ کے لئے صحت کا ایک علیحدہ ادارہ بھی قائم ہے۔

عرب لیگ کی تشکیل (جس کا مقصد عرب ممالک کی تعلیم سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی ترقی کے لئے یکساں پالیسی مرتب کرنا ہے) اور معاہدۂ سعدآباد، (جو ترکی، عراق، ایران اور افغانستان کے درمیان ہوا تھا) کا باعث مشرق وسطیٰ کے یہی مشترک مسائل ہیں۔

(ثروت خان)

اے نیند! اے بحر عمیق و بے پایاں! اے سنسان اور خاموش آب رواں تیری امواج کی رفتار غیر محسوس، عالم آب و گل کے ساحل کو کس خاموشی سے کمزور و ناتواں تھپیڑے دیتی ہے۔ دیکھ کر میں دنیا کی شورشوں اور ہنگاموں سے گھبرا کر اپنے آپ کو تیرے رحم پر چھوڑنے آیا ہوں۔ اب تو ہی میری مالک و مختار ہے اے عالم خواب کے تاریک سمندر تیرا پانی آب حیات ہے۔ تیرے ایک ہی غوطے میں میرے خزاں دیدہ غنچۂ دل کو میرے افسردہ و مضمحل اعضاء کو از سر نو شگفتگی و حیات میسر ہوتی ہے۔ تیری ہر لہر میرے دل سے تفکرات و مصائب کے داغوں کو دھو جاتی ہے۔ تیری ہر موج میری ناکامیوں کے تاریک تصور کو فراموشی کی لوری دیتی ہے۔ اور مجھے مخمور خوشبوئیں سنگھا سنگھا کر اور مدہوشی کے جام پلا پلا کر اپنے افسون خواب کا اسیر بنا لیتی ہے۔

لے۔ اب اپنی لطیف موجوں کو تحریک ارتعاش دے کہ میں خود ہاتھ باندھے تیرا اسیر بننے کے اشتیاق میں کھڑا ہوں۔ اے میری نگاہ خیال کی وسعت سے بھی دور تک پھیلے ہوئے ذخار و ناپید کنار سمندر! اپنے آپ کو تیرے طوفان موج افزا کے سپرد کرنے سے پیشتر میرے دل کی منکسرانہ و عاجزانہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ اگر تو مجھے اظہار گزارش کی اجازت دے اور میری التماس کو توجہ کے قابل سمجھے۔ تو تجھ سے کہوں۔ کہ میں اپنے آپ کو آنکھیں بند کر کے ایک تنکے کی طرح تیرے سپرد کر رہا ہوں، تو مجھے کسی ایسے جزیرے پر نہ جا پٹکنا، جہاں دنیائے زندگی کی سی مصائب حکمران ہیں اور روحیں دردوں سے مصروف پیکار ہیں۔ اور جہاں خوف و دہشت تیری تخیل آفریں کی آغوش سے نکل کر پنپتے ہیں۔ بلکہ اپنی خوشگوار لہروں کے بازوؤں پر اٹھا کر مجھے پھر ایک بار اس سرزمین میں پہنچا دینا۔ جہاں وہ طلسمی فراز طلسم کی حسین ملکہ جلوہ افروز ہو۔ تو کیا میں امید رکھوں کہ اس کی کاکل پیچاں کے مرغولے اس کے عریاں شانوں گردن اور سینے کے اوپر بکھرے ہوئے دیکھوں گا۔

تاج

سمرقند کی تعمیر!

چودھویں صدی کے سب سے خوبصورت شہر اور مشہور شہر سمرقند کی تعمیر کی لرزہ خیز تاریخ اس پر شاہد ہے۔ کہ پرانے بادشاہوں نے فن کی سرپرستی اپنے ذاتی اقتدار کو بڑھانے کے لئے کی ہے، انسانیت کی بہبود کے لئے نہیں۔

اس شہر کے اجڑنے اور بسنے کی مسلسل داستان یوں تو بہت لمبی ہے۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا۔ کہ چنگیز کے تباہ و برباد کر دینے کے بعد تیمور نے سمرقند کو دوبارہ آباد کیا۔ اس کے بعد کئی صدی تک یہ شہر علم و ادب اور تہذیب کا گہوارہ بنا رہا۔ روم سے سکندر اعظم کی عظمت کا آفتاب بھی اس کے سامنے نہیں ٹک سکا۔

کہا جاتا ہے۔ کہ تیمور نے سمرقند کو جو مٹی کے مکانوں کا ایک شہر تھا۔ خوبصورت بنانے کا ایک خواب دیکھا تھا وہ خواب معلوم نہیں، کتنا بھیانک تھا جس کی تعمیر کیلئے سارا ایشیا اجڑ گیا۔

تیمور کسی ملک کے حسن اور عظمت کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ایشیا کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ لیکن یہی جنگلی اور وحشی تیمور سمرقند کا معمار تھا۔ مفتوحہ علاقوں کی خوبصورت عمارتوں کو برباد کرنے سے پہلے اپنے مصوروں سے ان کی تصویریں اور نقشے بنوا لیتا تھا۔ اور پھر ویسی ہی عمارتیں سمرقند میں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ صرف اتنا فرق ہوتا تھا۔ کہ ان پر تاتاری بربریت اور فطرت پرستی کی جھلک آجاتی تھی۔ اور ان کا رنگ سبز اور نیلا ہو جاتا تھا۔ یہ آسمانی رنگ تھا۔ جو تیمور کو بہت پسند تھا۔ عمارتوں کے اصلی نام بدل جاتے تھے۔ اور اُن کی پیشانی پر سنہرے حروف میں تیمور کا نام اور اس کی شان میں قصیدے کندہ کر دئے جاتے تھے۔

جب تیمور کسی مہم سے واپس آتا تھا۔ تو اس کے ساتھ مفتوحہ ملکوں کا مال و دولت، وہاں کی عمارتوں کے نقشے، اور تصویریں اور ہزاروں غلاموں، معماروں اور فن کاروں کے گروہ ہوتے تھے۔ ۸۰۱ھ ۱۳۹۹ء کا موسم بہار ہے۔ دریائے زرافشاں کے کنارے سمرقند کی تعمیر ہو رہی ہے۔ باغ لگائے جا رہے ہیں۔ سارا شہر تبریز کے سنگ مرمر، ہرات کی چمکدار اینٹوں اور ختن کے سبز اور نیلے پتھروں سے پیارا ہے نگاہ کرنے والے طرح طرح کی شکل و صورت کے انسان ہیں۔ اور مختلف زبانیں بول رہے ہیں۔

عرب باغبان دو رویہ درخت لگا رہے ہیں۔ جغرافیائی خطوط کے اندر چمن بندی کی جا رہی ہے۔ آرمینیا کے سنگ تراش محلوں میں لگنے والی اینٹوں پر اپنی چھینیوں سے نقش و نگار بنا رہے ہیں۔ تیمور کے تین منزلہ محل میں سنگ مرمر کے ستون کھڑے کئے جا رہے ہیں۔ دیوان نیلی اینٹوں کا ہے۔ جس کی دیواروں اور چھتوں پر ہندوستانی اور چینی مصور بیل بوٹے بنانے میں مصروف ہیں۔ باقی دیواریں سفید سنگ مرمر کی ہیں۔ جن کی جلا آئینوں کو شرما رہی ہے۔ پہاڑی پر تیمور کی بیویوں کے محل اور باغ بن رہے ہیں۔ وسط میں ایک چینی عبادت گاہ کی طرز کی عمارت ہے۔ یہ تیمور کی چینی بیوی ملکہ سرائی ملک خانم کا محل ہے۔ اس کے گرد لالے اور گلاب کے کنج ہیں۔ باغ میں جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ جن کی ڈوریاں ریشمی اور ستون سنہری ہیں۔

ایران اور بخارا کے قالینوں اور ہندوستانی اور چینی ریشم کے ڈھیر لگے ہیں۔ دمشق کے کانوں کے ہیرے سمرقند میں چمک رہے ہیں۔ یہ خزانے لوٹ کے ہیں۔ شہزادیاں ایران میں تیمور کی فتح کے جشن منا رہی ہیں۔ تیمور کا خاص قاصد ایران سے تحفے لے کے آیا ہے، ایرانی شہزادیوں کے ہار، اور گلوبند تاتاری شہزادیوں کی گردن میں جگمگا رہے ہیں۔

موسم بہار گذر گیا۔ سمرقند کی تعمیر ہو رہی ہے۔ ایران کی دولت، وہاں کے جواہرات اور قیمتی پتھر ڈھیر کے ڈھیر۔ سمرقند میں آ گئے ہیں۔ اصفہان نے اپنے دروازے تیمور کے لئے کھول دئے تھے۔ تیمور نے ساری دولت جمع کی۔ اور پھر شہر کو آگ لگا دی۔ تین دن کے اندر ستر ہزار آدمی قتل کئے گئے۔ جن کے سروں کے ڈھیر لگا کر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بنا دی گئی تھیں۔ جن کی ہڈیاں راتوں کو چمکتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہزاروں بھوت ناچ رہے ہیں۔ جہاں پہلے، ایک مہذب شہر آباد تھا۔ وہاں اب بھیڑیوں، گیدڑوں اور گدھوں کا راج تھا، تیمور کی اس بربریت نے سارے ایشیا کے دل کو ہلا دیا۔

سمرقند کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اصفہان کی دولت اس تعمیر میں صرف ہو چکی ہے۔ تیمور نے بغداد سے نیا سامان بھیجا ہے۔

سمرقند کی تعمیر ہو رہی ہے۔ ہندوستان سے دو سو ہاتھیوں کی قطاریں آتی ہیں۔ جن کی پیٹھ پر خزانے لدے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ گندمی رنگ کے ہزاروں غلام ہیں۔ جو تاتاری۔ گھوڑوں کے آگے آگے دوڑتے ہوئے آئے ہیں۔ معلوم نہیں کتنے راستے میں مر کھپ گئے۔

دریائے زرافشاں کے کنارے ایک ہزار ہندوستانی غلام اپنے زخمی ہاتھوں سے ایک نئی مسجد تعمیر کر رہے ہیں۔ جس کا نقشہ تیمور ہندوستان سے لایا ہے۔ ان غلاموں کے سروں پر تاتاری تلواریں چمک رہی ہیں۔ اور پیٹھ پر کوڑوں کے نشان ہیں۔

سمرقند کی تعمیر ہو رہی ہے رمضان کا مہینہ ہے۔ تیمور ایک اور مسجد بنانے کا خواب دیکھتا ہے۔ جو دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہوگی۔

مئی اور جون ۱۳۹۹ء میں دور دراز ملکوں سے ہزاروں نئے معمار لائے گئے ہیں۔ تین سو ہندوستانی اور ایرانی معمار مسجد کے اندر کام کر رہے ہیں۔ پانچ ہزار غلام پہاڑوں پر پتھر کاٹنے میں مشغول ہیں۔ جنہیں ہندوستانی ہاتھی گھسیٹ گھسیٹ کے لا رہے ہیں۔ محرابوں پر قرآن کی آیتیں لکھی جا رہی ہیں۔ خوبصورت گنبد اور حسین مینار ابھر رہے ہیں۔ مظلوم اور بے بس معماروں کی روح کا حسن پتھر کے قالب میں ڈھل گیا ہے۔

اگست کا مہینہ ہے۔ مسجد تیار ہو گئی ہے۔ تیمور کو ضد سوار ہوتی ہے۔ کہ بیس دن کے اندر شہر سے دریا تک ایک لمبی سڑک تیار ہو جانی چاہئے۔ حکم عدولی کی سزا موت ہے۔ شہر سے دریا تک کے راستے کے مکانات ڈھائے جاتے ہیں۔ لوگ بے گھر ہو کر بھاگ رہے ہیں۔ بہت سے ان مکانوں کے نیچے دب کر مر رہے ہیں۔ رات دن کام ہو رہا ہے۔ رات کو مشعلوں کی روشنی میں کام کرتے ہوئے غلام جناتوں کی

... ہوتے ہیں۔

سمرقند کی تعمیر ہو رہی ہے۔ سال ختم ہو گیا۔ سمرقند کو حلب اور دمشق کی دولت کی ضرورت ہے، نیا سال شروع ہوا۔ دمشق جل رہا ہے۔ تیمور شعلوں میں لپٹے ہوئے شہر کو دیکھ رہا ہے جس کی نظر ایک جلتی ہوئی مسجد پر پڑتی ہے جس کی شکل انوکھی سی ہے۔ صناعوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ مسجد کی تصویر بنائیں۔ چند ماہ بعد اس قسم کا ایک محل سمرقند میں بن جاتا ہے۔ ہندوستان میں سو برس بعد شاہجہاں کی بنائی ہوئی مسجدوں اور تاج محل میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

سمرقند کی تعمیر ہو رہی ہے۔ تیمور نے دوبارہ بغداد کو فتح کر لیا ہے۔ سارا شہر مسمار کر دیا جاتا ہے۔ صرف مسجد اور بعض خوبصورت عمارتیں رہ جاتی ہیں۔ جن کا ایک ایک پتھر ایک ایک اینٹ سمرقند پہنچا دی جاتی ہے۔

سمرقند کی تعمیر ہو چکی ہے۔ تیمور کی بیویوں اور بیٹوں کے مقبرے ہیں۔ یہ شاہی محل ہیں۔ یہ قومی عمارتیں ہیں سارا شہر فیروزے کی طرح چمک سے جگمگا رہا ہے۔ مدرسے مسجدیں، سرائے، خانقاہیں، بازار، باغات تیمور کی عظمت اور جلال کی شہادت دے رہے ہیں۔ مسجدوں میں بغداد کے قرآن کا درس دے رہے ہیں، جن کی مقدس دعائیں ان کے سینوں پر لہرا رہی ہیں۔ مدرسوں میں بوعلی سینا کی حکمت، ارسطو کا فلسفہ اور سائنس پڑھائی جا رہی ہے۔ تاریخ، فقہ اور علم الکلام کے مسائل حل ہو رہے ہیں۔ نجومی آسمانوں کی پیمائش کر رہے ہیں۔ اور ستاروں کی گردش کے راز بتا رہے ہیں۔ باغوں میں پھول کھلے ہیں۔ محلوں میں شراب انڈھائی جا رہی ہے۔ بازاروں میں عرب اور چینی تاجر تجارت کر رہے ہیں۔

اس طرح ایشیا اجڑ کر سمرقند آباد ہوا۔ جہاں، مودی تیمور کے خطبے پڑھتے تھے۔ اور اسے صاحبقران اور ظل اللہ کا خطاب دیتے تھے۔ شاعر اپنے قصیدوں میں اسے فاتح اعظم کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ صناع، معمار اور فن کار دلوں اور تلواروں کے ڈر سے تیمور کو خوش کر کے اپنے فن کی ساری لطافتیں اس کے قدموں پر قربان کر رہے تھے۔ چینی، ایرانی اور ترکی دوشیزائیں کنیزیں بن کر آ رہی تھیں۔ بڑے بڑے بادشاہ اپنی نوخیز بیٹیوں کو اس ... سے بیاہ کر بھیجتے تھے۔ اور سمرقند ... تیمور کی ... تھی ... دنیا میں علم ...

ادب پروری اور عدل گستری کی داد دیتے تھے، اور مورخین نے یہاں تک لکھا ہے کہ تیمور سے محبت کرتے تھے سمرقند کی تعمیر نے ایشیا کی تاراجی پر پردہ ڈال دیا تھا۔ سفید، سبز اور نیلی عمارتوں کی چمک کے آگے لوگ تیمور کی بربریت کو بھول گئے تھے۔

(محمد مہدی)

بقیہ اونٹ کی بیٹھک!

ملازم نے مختلف اخبارات کے نامہ نگاروں کے آنے کی اطلاع دی۔ انہیں کمرے میں بلا لیا گیا۔ وہ سیٹھ کے سنسنی خیز قتل کے سلسلے میں تازہ تفتیش کی تفصیل معلوم کرنی چاہتے تھے۔ میں نے بناوٹ سے کام لئے بغیر صاف لفظوں میں اپنی ہار مان لی۔ اور کہہ دیا، کہ یہ معاملہ اتنا پیچیدہ ہے کہ عقل انسانی فی الحال اس عقدہ کشائی سے عاجز ہے۔ لیکن میاں عبدالعزیز نے میری تائید نہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم سے دوران تفتیش میں کچھ فروگذاشت ہو گئی ہے جس کا لحاظ رکھتے ہوئے نئے سرے سے پورے معاملے پر غور کیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ دو چار دن میں بہت سے راز منکشف ہوں گے اور قاتلوں کا پتہ لگ جائیگا

بس پھر کیا تھا۔ دوسرے ہی دن ہمارے ان بیانات کے اخباروں میں افتتاحی مقالے بھی لکھے گئے، جن میں بہت سے پچھلے واقعات کی تفصیل موجود تھی۔ ان میں خوب دل کھول کر میری مذمت اور افسران پولیس کی تعریف کی گئی۔ اور مطالبہ کیا گیا کہ آئندہ حکومت ان معاملات میں پرائیویٹ سراغرسانوں سے مدد نہ لیا کرے، جن کی تحقیق و تفتیش سرکاری طور پر ہو رہی ہو۔ کیونکہ یہ لوگ عموماً ذاتی نام و نمود کے خیال سے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتے ہیں۔

پھر دوسرے دن سے اخبارات کے نام آئے ہوئے خطوط کا سلسلہ شائع ہونا شروع ہوا۔ جن سے رائے عامہ میرے خلاف تقویت حاصل کرتی چلی گئی۔ میں جانتا تھا کہ یہ محاذ قائم کرنے میں افسران پولیس کا خصوصاً میاں عبدالعزیز کا ایماء اشارہ شامل ہے۔ مجبوراً مجھے ان معاملات سے علیحدگی اختیار کر لینی پڑے گی"

اگلے تین چار دن میں پولیس نے دو آدمیوں کو قتل کے الزام میں ماخوذ کیا۔ اور گھر کے سب ملازموں کو حراست میں لے لیا۔ مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ اور کچھ عرصے بعد عدالت نے ان دونوں کو پھانسی کی، اور باقی کو تین تین سال قید بامشقت کی سزا دیدی۔ ایک بار پھر میرے خلاف زہر اگلا گیا۔ اور میں اپنی شہرت کھو کر بام عروج سے قعر ذلت میں گرتا چلا گیا۔ حالانکہ میں اب وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ جن لوگوں کو پھانسی کی سزا ملی۔ وہ بالکل بے قصور تھے۔ پولیس نے صرف اپنی کارگذاری دکھانے کیلئے پھانس لیا۔

یہ عجیب و غریب معاملہ یہیں ختم ہو جاتا۔ تب بھی بہت سی باتیں حیرت انگیز کہی جاتیں، لیکن ڈرامے کا آخری پردہ ایک ماہ بعد گرا، جبکہ اخباروں میں خود سیٹھ ایوب صابر کا بیان شائع ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے خفیہ طور پر اپنے بعض صنعتی اور تجارتی اداروں کا جائزہ لینا تھا، اس لئے میں کسی کو بتائے بغیر یہاں سے روانہ ہو گیا۔ البتہ میری غیر موجودگی میں اپنے ایک ہم شکل کو مکان پر چھوڑ گیا۔ اور اسے تاکید کر دی۔ کہ میرے تمام کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ افسوس ہے کہ دوسرے ہی دن اس غریب پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اور وہ اس جہان سے کوچ کر گیا۔

لیکن لوگوں نے اس بیان کو من گھڑت قصے سے تعبیر کیا۔ حتیٰ کہ ان کی شریک حیات نے بھی ان کو مکان میں داخل ہونے نہیں دیا۔ انہوں نے پولیس میں رپورٹ کر دی۔ کہ یہ شخص نقلی سیٹھ ہے۔ ساری دنیا کو فریب دینا چاہتا ہے کیونکہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں۔ کہ میرا اصلی شوہر فوت ہو چکا ہے۔

چنانچہ پولیس نے دھوکہ دہی کے الزام میں ان کو قید کر لیا۔ اور عدالت نے مجرم ٹھہرا دیا۔ ان کی چیخ و پکار کے باوجود انہیں سات سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی۔

ساری دنیا میں صرف میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ سیٹھ صاحب قتل نہیں ہوئے، وہ جیل کی چار دیواری میں بلاوجہ سزا بھگت رہے ہیں۔ اور ان کی شریک حیات جس نے ڈرامے کا آخری پردہ گرنے کے تیسرے دن میاں عبدالعزیز سے شادی کر لی تھی، بالکل جھوٹی ہے۔

ہفتہ وار "نوروز" عنقریب صحافت کا معیار بلند کر دیگا اسکے تمام رنگوں سے بے نیاز

مغویہ عورتیں

ہندستان اور پاکستان میں آزادی کی سب سے زیادہ قیمت مستورات کو ادا کرنی پڑی۔ جن کا سیاسیات سے نہ کوئی تعلق تھا۔ نہ واسطہ۔ ہندستان میں ہندوؤں اور پاکستان میں مسلمانوں نے آزادی کا استقبال ان معصوم دیویوں کی عصمت دری اور بے عزتی سے کیا۔ جو لوگ دونوں گورنمنٹوں کے ماتحت ہندوؤں اور مسلمانوں نے مستورات سے کیا۔ اس کو صدیوں تک نہیں بھلایا جا سکتا۔ اور مہذب دنیا میں ہمیشہ نفرت اور برائی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ بلکہ یہ ٹیکہ دونوں حکومتوں اور دونوں قوموں کے ماتھے پر ہمیشہ کے لئے رہے گا۔ زیادہ افسوسناک امر یہ ہے۔ کہ برائی کا وہ معاملہ جو دونوں قوموں نے ۱۹۴۷ء میں شروع کیا تھا ابھی تک بند نہیں ہوا۔ اور کوئی شخص اپنے اس فعل پر پشیمان اور نادم نظر نہیں آتا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامی حالات کے مجرم ابھی تک ہیرو ہی بنے پھرتے ہیں۔ اور ہماری سوسائٹی اور حکومت ان مجرموں کو سزا دینا تو درکنار، برا بھی تصور نہیں کرتی۔ ہمارے اخلاق کا یہ سٹینڈرڈ ہے۔ کہ کسی کو جرأت نہیں کہ برائی کو برائی کہہ سکے یہ حقیقت ہے۔ کہ ابھی تک پاک پنجاب میں غیر مسلم اغوا شدہ مستورات موجود ہیں۔ گو ان کی تعداد مسلمان لڑکیوں کے مقابلے میں جو مشرقی پنجاب میں ہیں، آٹے میں نمک کے مصداق ہے۔ لیکن ایک غیر مسلم لڑکی کو بھی اغوا کر کے رکھنا ہماری قوم اور گورنمنٹ کیلئے باعث بدنامی ہے ہمارے اخلاق اور انصاف اور اسلامی روایات یہ اجازت نہیں دیتیں۔ کہ غیر مسلم مستورات کو اس طرح اغوا کر کے رکھا جائے۔ ایسا کرنا شرعاً اور قانوناً جرم ہے۔ یقیناً ایسا کرنے والے ہماری سوسائٹی کے بدترین انسان ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں۔ کہ ان معدودے چند غنڈے عیاشوں کی وجہ سے ہماری ہزار ہا دوشیزائیں غیر مسلموں کی گود کی آرائش بنی ہوئی ہیں۔ کبھی مسلمان انصاف اور اخلاق کا پرچم لیکر دنیا کو سبق سکھانے کیلئے آگے بڑھا تھا۔ اور آج اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر غیر مسلم مستورات کو پناہ دینے کی بجائے اپنی عیش کا موجب بنایا جا رہا ہے۔ عجب کہ اس کو اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ اس کے اس فعل کے عوض ہندستان میں کئی گنا زیادہ مسلم مستورات کو اس کے اس جرم کا کفارہ دینا پڑے گا۔ کچھ مطلب پرست لوگ اپنا الو سیدھا کرنے کی غرض سے یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ مشرقی پنجاب میں غیر مسلموں نے مسلم مستورات اغوا کر رکھی ہیں۔ اس لئے ان کا بدلہ لینے کے لئے مغربی پنجاب میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کی لڑکیوں کو اغوا کیا۔ ایسا کرنا سوچنا ہماری انتہائی پستی کا ثبوت ہے کیونکہ اگر بدلہ لینے کی ہمت ہے، تو مشرقی پنجاب میں ان غیر مسلموں سے لیا جائے۔ جنہوں نے مسلمانوں کی لڑکیوں کو اغوا کیا۔ مغربی پنجاب کے غیر مسلموں نے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا کیا بگاڑا۔ دوسرے جس مسلمان کی بہن یا بہو یا بیٹی مشرقی پنجاب میں [illegible] اس بات سے کیا تسکین ہو سکتی ہے [illegible] غیر مسلم کی لڑکی مغربی پنجاب [illegible] تسکین تبھی ہو سکتی ہے۔ [illegible] برائی کا برائی سے نہیں۔ بلکہ نیکی اور اخلاقی حربوں سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔

اسی طرح ہندستان میں پنڈت نہرو اور دیگر نیتا ۱۹۲۰ء سے انصاف [illegible] چلے آئے ہیں۔ آزادی ملنے کے بعد [illegible] ہندستان کے وزیر اعظم بنے تو ان کے [illegible] یہ متوقع تھا، کہ اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہناتے۔ لیکن افسوس پنڈت جی نے پاکستان کی نفرت کے جذبات میں بہہ کر اپنے سب اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ روحانیت کے سب سے بڑے دیوتا مہاتما گاندھی کے اس چیلے کی اپنی خالص کانگرسی حکومت میں مہاتما اور روحانیت کے گلے پر کند چھری چلائی جا رہی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں۔ کہ پنڈت نہرو کا قانون اور عدالتیں ایسے ایسے سنگین مجرموں کے خلاف کارروائی کرنے سے صرف اس لئے قاصر ہیں۔ کہ مظلوم مستورات مسلم ہیں۔ اور ظالم غیر مسلم۔ کاش پنڈت جی ایک منٹ کیلئے سوچیں۔ کہ ان کے اس فعل کو آنے والے مورخ کس طرح لکھیں گے۔ آخر ان معصوم بچیوں نے پنڈت جی اور ان کی حکومت کا کیا بگاڑا ہے۔ اور ان کو غنڈوں اور بدمعاشوں کے پھندے سے برآمد نہ کروا کر وہ کونسی قومی، سیاسی یا مذہبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کو پاکستان سے نفرت اور دشمنی ہو۔ لیکن ان معصوم دیویوں سے اس کا بدلہ کیوں لیا جاتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ پہل پاکستان میں ہوئی (عموماً انڈیا میں یہی پروپیگنڈا ہے) تو کیا پنڈت جی یہ گوارا کریں گے۔ کہ ایک برائی اور ظلم صرف اس لئے کیا جا رہا ہے۔ کہ ان کا پڑوسی ایسا کرتا ہے، اور اس کے علاوہ انصاف اور نیک کام نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کا پڑوسی ایسا نہیں کرتا۔ انصاف اور قانون کی نگاہ میں ایک ایک جرم جرم ہے۔ خواہ اس کا کرنے والا ہندو ہو یا غیر ہندو، میں پنڈت جی اور ان کے رفقاء سے ان کے بلند اخلاق اور اصولوں کا واسطہ دے کر یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ صرف انصاف اور قانون کے مطابق کام کریں نہ کہ دوسروں کی پیروی کریں۔ ہندستانی مسلمانوں کو ان سے بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

دونوں حکومتوں نے مغویہ مستورات کی برآمدگی کیلئے مختلف طریق اختیار کئے۔ مگر سب ناقص اور غیر تسلی بخش ثابت ہوئے۔ نہایت افسوس کا مقام ہے۔ کہ دو سال کے لمبے عرصہ میں حکومت اس اہم کام کو انجام نہیں دے سکی۔ دونوں حکومتوں نے بارہا اعلانات کئے۔ کہ ایک ایک مغویہ برآمد کی جائے گی۔ مگر آج دو سال کے بعد ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہزارہا والدین اپنی بچیوں کی جدائی میں خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ یا تو حکومتیں خود اس کام کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچانا چاہتیں۔ یا یہ گورنمنٹیں اس قدر کمزور ہیں۔ کہ ان میں اپنے حکم کو عملی جامہ پہنانے کی اہلیت نہیں ہے۔ حکومتوں کی پہلی غلطی تو یہ تھی۔ کہ انہوں نے اس فیصلے کو مغویہ کے بیانات پر منحصر رکھا۔ ماحول کے خوف کی وجہ سے مغویہ کو مجبوراً اغوا کنندہ کے حق میں بیان دینے پڑے، اور مغویہ کو پھر سے عدالت کے ذریعے اغوا کنندہ کو واپس دیدیا جاتا۔ گویا اس طرح حکومتوں نے خود عدالتوں کے ذریعے اس سنگین جرم کو قانوناً جائز قرار دیدیا۔ جس سے اغوا کنندگان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اور وہ سمجھے کہ حکومت اور قانون ان کی امداد کے لئے ہے۔

۲۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کے معاہدے کے بعد عدالتی ٹریبونلوں کا سلسلہ ختم ہوا۔ لیکن کام پھر بھی اس جذبے سے نہ ہوا جس طرح کہ ہونا چاہئے تھا۔

جون ۱۹۴۹ء میں ملٹری کو بھی واپس بلا لیا۔ اور اس کی جگہ پولیس چلی گئی۔ پولیس اس قدر مستعدی اور جفاکشی سے کام نہ کر سکی جس قدر کہ ملٹری نے کیا تھا۔ گزشتہ ستمبر میں ملٹری کو بھی واپس بلا لیا۔ اب صرف لائزن اسٹاف باقی رہ گیا۔ لیکن یہ بھی صرف نام کیلئے رہ گیا تھا۔ ورنہ کام بند ہو گیا تھا۔ آخر اکتوبر کے آخر میں لائزن اسٹاف بھی واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد ایک نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا کہ آئندہ ہندوستان گورنمنٹ اور پاکستان میں پاکستان گورنمنٹ برآمدگی کی ذمہ دار ہوگی مگر آج اس پالیسی کو آٹھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے، نتیجہ وہی ہے۔ کام کی نوعیت بھی تبدیل نہیں ہوئی۔ اگر پاکستان سے دس لڑکیاں برآمد ہوتی ہیں تو ہندوستان میں بھی اسی تعداد کے لگ بھگ برآمدگی ہوتی ہے۔ ہر دفعہ ایک حکومت دوسری کی پیروی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور صحیح جذبے سے کام نہیں کیا جاتا۔ بلکہ میں تو صاف کہوں گا کہ دونوں طرف تعصب اور نفرت کے جذبات ابھی تک قائم ہیں۔ ورنہ یہ ہفتوں کا کام سالوں تک نہ جاتا۔

مجھے ضلع امبالہ کے متعلق ذاتی علم ہے۔ کہ نئی پالیسی اختیار کرنے کے بعد وہاں سے معدودے چند مستورات برآمد ہوئی ہیں۔ حالانکہ وہاں چار سو کے قریب ایسی لڑکیاں موجود ہیں۔ جن کی فہرست میرے پاس موجود ہے (جس کی نقل پنڈت نہرو اور خواجہ ناظم الدین کو بھی بھیجی گئی تھی) اور اغوا کنندگان، میں سے نوے فی صدی کے گھروں کے دروازوں اور مکانوں، رشتہ داروں اور دیگر اڈوں کا مجھے علم ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں، کہ اگر مجھے مقامی افسران کی پوری امداد حاصل ہو تو ان مستورات کو دو ہفتے کے اندر اندر برآمد کر سکتا ہوں ابھی تک کئی ایسی لڑکیاں بھی برآمد نہیں ہو سکیں۔ جن کو عدالتوں کے ذریعے ضمانتوں پر واپس کیا گیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے۔ کہ ابھی تک حکومتیں اس کام کو ایمانداری سے کرنا نہیں چاہتیں۔ خالی بیانات اور اعلانات سے یہ کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔

اگر حکومتیں واقعی اس کام کو کم سے کم عرصے میں انجام دینا چاہیں تو وہ ضلعوں کے ڈپٹی کمشنروں اور پولیس کپتانوں کی معرفت آسانی سے ایسا کر سکتی ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہر ضلع کا ڈپٹی کمشنر اور پولیس کپتان جو چاہے سو کروا سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے ماتحتوں کو سمجھا دیں۔ کہ تمام کی تمام مستورات کم از کم عرصے میں برآمد کرو، تو بہت آسانی سے برآمد ہو سکتی ہیں۔ میری ایک قریبی رشتہ دار لڑکی باوجود انتہائی کوششوں کے برآمد نہ ہو سکی۔ حالانکہ میرے تعلقات مقامی طور پر بہت اچھے تھے۔ ذاتی کوششوں سے ناکام ہو کر میں نے ضلع کے ڈپٹی کمشنر مسٹر گریوال سے اس بارے میں درخواست کی۔ اس لئے میرے حال پر مہربانی کرتے ہوئے ایس۔ ڈی۔ او صاحب کو حکم دیا کہ مذکورہ لڑکی کو تین دن کے اندر برآمد کر کے کیمپ بھیج دیں۔ چنانچہ لڑکی تین دن کی بجائے دو دن میں اسی تھانیدار اور پولیس کی معرفت برآمد کی گئی۔ جس نے مجھے کئی بار ٹرخا دیا تھا اسی طرح جمعدار حنیف خان کی بیوی جو سلطان گاؤں ہمارے کیمپ میں آ گیا تھا۔ پریتم سنگھ بدمعاش سے باوجود ہماری بار بار، کوششوں سے چار ماہ تک برآمد نہ ہو سکی۔ آخر میں نے مسٹر اشونی کمار پولیس کپتان سے اس معاملہ میں مدد چاہی۔ اس نے تھانیدار متعلقہ کو برآمدگی کے لئے حکم دیا، اسی تھانیدار نے جس نے بار بار یہی کہہ کر ٹال دیا تھا۔ کہ اسے اس عورت کا علم ہی نہیں، ایک رات کے اندر اندر ضلع ہوشیارپور کے ایک گاؤں سے عورت کو برآمد کر دیا۔

اب تک برآمدگی ایک ایک کر کے ہوتی رہی ہے لیکن اس کام کو اگر مجموعی طور پر کرایا جائے تو بہت جلد کام ختم ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر ڈپٹی کمشنر اور پولیس کپتان، تحصیلداروں اور تھانیداروں کو اپنے اپنے علاقہ سے مغویہ عورتوں کو، مقررہ تاریخ پر مختلف سنٹروں میں جمع کرنے کو کہا جائے تو اس طرح ایک دو دفعہ کرنے کے بعد اکثریت برآمد ہو جائے گی۔ اور چند ایسی لڑکیاں رہ جائیں گی، جن کی برآمدگی مشکل ہوگی۔

میرا ذاتی تجربہ ہے۔ کہ مسٹر گریوال نے میری درخواست پر سب ڈویژن روپڑ میں ۲۴ نومبر کو مبارک پور، منی مزرعہ، کھرڑ، کورالی اور روپڑ کے سنٹروں میں مغویہ مستورات اور مرتد مسلمانوں کو جمع کرا دیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سینکڑوں کی تعداد میں لڑکیاں موجود تھیں، مگر ہماری بدقسمتی کہ اس وقت حکومتوں کی پالیسی مختلف تھی۔ اور برآمدگی کا، فیصلہ مغویہ مستورات کے بیانوں پر مبنی ہوتا تھا اس لئے ہم ان تمام مستورات کو واپس لانے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن پھر بھی ایک دن میں ۹۰ مستورات پاکستان جانے کو رضامند ہوئی تھیں۔ میں نے اس وقت دیکھا۔ کہ اپنے اپنے حلقے کے پٹواریوں اور تھانیداروں نے اغوا کنندگان سے مستورات پیش کرنے کی ضمانتیں لی تھیں۔ اگر اب اس پر عمل پیرا ہو جائے، تو نہایت اچھے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور کم سے کم عرصہ میں یہ کام ختم کیا جا سکتا ہے۔

آج کل برآمدگی کی ذمہ داری صرف سپیشل سٹاف پر ہی ہے۔ لیکن مقامی طور پر سب سے زیادہ اثر و رسوخ مقامی پولیس کا ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے۔ کہ مقامی پولیس کے تعاون کے بغیر یہ کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ ہم اسٹاف کے ساتھ صرف اس لئے کامیاب نہ ہوئے کہ مقامی پولیس کا تعاون نہ تھا۔ میرے خیال میں اگر ہر تھانہ کے انچارج کو یہ حکم دیا جائے کہ فلاں تاریخ اپنے علاقے کی مغویہ تمام مستورات کو برآمد کر دو۔ تو اس طرح کام جلد از جلد ہو سکتا ہے۔ موجودہ طریق کے مطابق میں نے دیکھا۔ کہ مقامی پولیس والوں نے بجائے ہماری امداد کرنے کے اغوا کنندگان کی ناجائز امداد کی۔ کیونکہ ان کی برآمدگی کیلئے ذمہ داری نہ تھی۔

ہمارے خلاف سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی۔ کہ رائے عامہ ہمارے خلاف ہوئی تھی۔ عوام میں سے کوئی ایسا نہیں ہوتا تھا۔ جو ہمارے ساتھ تعاون کرے۔ یا کسی دیگر طریقے سے امداد کرے۔ بلکہ برعکس اس کے جہاں ہم جاتے فوراً یہ پروپیگنڈا ہوتا کہ پاکستان تو ہماری لڑکیاں واپس نہیں کرتا، ہم کیوں کریں؟ لیکن اگر رائے عامہ کو بذریعہ اخبارات ٹھیک کر لیا جائے، تو اس کام میں بہت زیادہ امداد مل سکتی ہے۔ اگر پبلک یہ سمجھے کہ خواہ دوسری حکومت کوئی لڑکی برآمد کرے یا نہ کرے، لیکن ہم غیر قوم کی ایک لڑکی بھی یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ چونکہ یہ، اخلاقاً اور قانوناً برا ہے۔

اب تک دونوں حکومتیں برائی کے مقابلے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی ہیں۔ اور اس کا نتیجہ دونوں کی تباہی کا باعث ہوتا رہا۔ اب نیکی کا راستہ اختیار کر کے بھی دیکھنا چاہئے۔ بالفرض ایک حکومت ایسا نہ بھی کرے۔ تو میں کہوں گا۔ کہ حکومت پاکستان کو اس نیکی میں پہل کرنی چاہئے، اور تمام غیر مسلم مستورات کو ایمانداری سے کم از کم عرصے میں برآمد کیا جائے بہر حال ہماری اپنی اغوا شدہ مستورات کو واپس لینے کا یہی واحد طریقہ ہے، کہ پہلے اپنے ملک سے غیر مسلم عورتوں کو برآمد کرنا چاہئے اور کلنک کا یہ ٹیکہ اپنے ماتھے سے دور کرنا چاہئے۔

محمد صدیق خان ایڈووکیٹ لاہور (سابق ڈسٹرکٹ لائزن آفیسر انبالہ)

از ایان بی بیرڈ :

"HIGH BLOOD PRESSURE."

خُون کا اعلیٰ دَباؤ

اُس کے اَسباب اور طریقِ علاج

(مُترجمۂ جناب زین العابدین صاحب سکاوہرتی)

ہم اکثر لوگوں کی زبانی یہ سنتے ہیں کہ فلاں شخص کو خون کا دباؤ (BLOOD PRESSURE) ہے۔ اور وہ اس کو بہت ہی خطرناک بیماری سمجھتے ہیں۔ میں نے ایک صاحب کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ: "بے چارہ سمتھ بہت بیمار ہے! مجھے یقین ہے کہ وہ خون کے دباؤ میں مبتلا ہے"۔ بے چارے سمتھ کی حالت واقعی بہت زیادہ قابلِ ترحم ہوتی اگر اس میں خون کا دباؤ نہ ہوتا۔ کیوں کہ خون کا دباؤ نہ ہونے کی صورت میں وہ ضرور مرجاتا۔ جہاں ہماری زندگی کے لئے اور چیزوں کی ضرورت ہے وہاں "بلڈ پریشر" یعنی خون کا دباؤ بھی ہونا ہمارے لئے ضروری ہے، کیوں کہ ہم اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہاں! یہ اُسی صورت میں ہمارے لئے مُضر اور صحت کا دشمن بن جاتا ہے، جب کہ اس میں غیر معمولی طور پر زیادتی یا کمی پیدا ہوجائے۔ خون کے دباؤ کا اعتدال پر نہ رہنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جسم کے کسی حصہ میں کوئی خرابی یا بیماری پیدا ہوگئی ہے، جس سے صحت کو خطرہ ہے۔ 'خون کا دباؤ' بذاتِ خود ایک بیماری نہیں ہے، بلکہ یہ تو صرف ایک علامت ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ ایک حیثیت سے محافظ بھی ہے۔ جس طرح کوئی صحت مند شخص خون کے نارمل دباؤ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، بالکل اسی طرح وہ شخص بھی خون کے اعلیٰ دباؤ (ہائی بلڈ پریشر) کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، جس میں جسمانی خرابیاں اور کمزوریاں پیدا ہوگئی ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ خون کا دباؤ نارمل حالت میں رہے، مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ خون کا دباؤ ہر شخص میں ہر دن اور ہر گھنٹہ بدلتا رہتا ہے۔ یہ اس چیز کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے جسم میں جو مختلف قوتیں ہیں، ان کا توازن کہاں تک درست ہے۔ کافی تحقیق کے بعد جسم کی اُن مختلف قوتوں کا پتہ لگالیا گیا ہے، جن سے خون کے دباؤ میں زیادتی پیدا ہوجاتی ہے۔ چناں چہ وہ عناصر یہ ذیل ہیں :—

جذبات۔ عادتیں۔ بیماری

جذبات : جوش، خوف، غصّہ، درد، پریشانی، گھبراہٹ، اشتعال اور دماغی افکار۔ آئیے اس سلسلہ میں میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ آپ نے پروفیسر جان ہنٹر کا نام سنا ہوگا۔ آپ انیسویں صدی کے مشہور و معروف تشریح داں (ANATOMIST) تھے۔ ان کے متعلق ایک دلچسپ قصّہ مشہور ہے اور اسے اکثر لوگ بطور حوالہ پیش کرتے ہیں۔ قصّہ یہ ہے کہ پروفیسر جان ہنٹر ابھی ادھیڑ عمر ہی کے تھے کہ انہیں خون کا اعلیٰ دباؤ (HIGH BLOOD PRESSURE) ہوگیا۔ اپنے لکچروں میں وہ لڑکوں سے ہمیشہ یہی کہا کرتے کہ میری جان کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو مجھے غصّے میں لا دے۔ کچھ دن بعد یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ ہوا یہ کہ ایک دن کوئی آوارہ گرد بھیک مانگنے پروفیسر کے گھر چلا آیا۔ اس کی بدتمیزی کی وجہ سے یہ کسی طرح اُس سے دھکّا کھا گئے، اس حرکت سے پروفیسر کو غصّہ آگیا اور لگے اس کو بُرا بھلا کہنے۔ چناں چہ انتہائی غصہ کے باعث وہ اسی وقت انتقال کرگئے۔

جن لوگوں کو خون کا اعلیٰ دباؤ رہتا ہے، انہیں اس وجہ سے بھی یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ جہاں تک ہوسکے غصّے میں نہ آئیں اور مشتعل ہونے سے پرہیز کریں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ طبّی معائنہ کرتے وقت مریض کو اپنی لاعلمی کی وجہ سے خون کا دباؤ زیادہ رہتا ہے اور جب اسے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے تو خون کا دباؤ فوراً گرنے لگتا ہے۔

عادتیں : ضرورت سے زیادہ کھالینا، بالخصوص مرغن اور ثقیل غذاؤں کا۔ الکوہل، چائے، کافی یا پانی کا کثرت سے پینا۔ ہاضمہ کی خرابی اور سخت محنت۔

بیماری : گُردوں کی بیماری کی مختلف اقسام، معدہ کی سوزش اندرا اور بدبو۔

غرض یہی وہ عناصر ہیں، جن کی وجہ سے خون کے دباؤ میں زیادتی پیدا ہوجاتی ہے۔

خُون کا کمتر دَباؤ :

آب دیکھا یہ ہے کہ کم (LOW BLOOD PRESSURE) یعنی خون کے دباؤ میں کمی کیوں پیدا ہوجاتی ہے اور اس کے کیا عناصر ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں: ایک جذباتی اور دوسری جسمانی کمزوری۔

جذباتی کمزوری : طبیعت کا اچاٹ ہونا اور کوئی ایسی بات پیش آنا جس سے دماغ میں پستی پیدا ہو۔

جسمانی کمزوری : تھکان، ہمیشہ بستر پر لیٹے رہنا، ہلکی پھلکی محنت، زور زور سے سانس لینا، خالی پیٹ رہنا، نباتات خوری (VEGETARIANISM) اور ایسی ویسی دواؤں کا استعمال۔

ہمارے جسم میں دورانِ خون کے لئے نالیوں کا انتظام ہے جنہیں ہم شریان کہتے ہیں۔ یہ مختلف سائزوں کی ہوتی ہیں، اور سارے جسم میں خون پہنچاتی ہیں۔ ان کا منبع دل ہے جہاں سے خون پمپ ہوکر نکلتا ہے۔ دل کے سکڑنے (CONTRACTION) سے خون پوری قوت کے ساتھ شریانوں میں داخل ہوکر دوڑنے لگتا ہے۔ اس سے آپ نے خیال کرلیا ہوگا کہ خون شریانوں میں دھار سے بن کر چکر کاٹتا ہے۔ نہیں! خون کا بہاؤ تو شریانوں کے لچکدار ہونے کی وجہ سے بالکل صاف اور ہموار ہوتا ہے۔ جب شریانوں میں خون داخل ہوتا ہے، تو وہ پھول جاتی ہیں اور جب دل سستانے لگتا ہے تو یہ خود آگے بڑھتی ہیں اور خون کو مسلسل آگے دوڑاتی ہیں۔

خُون کا نارمل دَباؤ :

(NORMAL BLOOD PRESSURE) خون کے نارمل دباؤ کے لئے یہ ضروری ہے کہ دل ایک پمپ کی طرح خوبی کے ساتھ کام کرتا رہے، اور اُدھر شریانوں میں لچک دار (ELASTIC) رہنے کی صلاحیت رہے۔ اس کے ساتھ خون کا بھی پاک صاف رہنا ضروری ہے۔ یعنی خون نہ تو حد سے زیادہ گاڑھا رہے، اور نہ حد سے زیادہ پتلا، بلکہ معتدل طور پر رہے، اور یہ خارجی اجزا سے بالکل پاک ہو — جہاں یہ باتیں نہ ہوں، یہ سمجھ لینا چاہئے کہ خون کا دباؤ نارمل حالت میں نہیں ہے اور جسم میں کہیں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔

خون کے اعلیٰ دباؤ کی علامتیں :

سر میں درد، چکر، سر میں آوازیں، بے خوابی یعنی نیند کا نہ آنا، سانس میں رکاوٹ، درد دل، تھکان اور سستی۔ یہ سب عام طور پر خون کے اعلیٰ دباؤ کی علامتیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مختلف وقفوں کے ساتھ یہ علامتیں بار بار ظاہر ہوں۔ بہت سے ایسے CASES بھی دیکھے گئے ہیں کہ بصارت میں فرق آجاتا ہے۔ بازوؤں میں اور انگلیوں میں جھنجھناہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ سُن ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ناک سے خود بخود خون بہنے لگتا ہے، اور یہ ایک حیثیت سے مفید بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ جب خون کا دباؤ زیادہ رہتا ہے تو اس وقت ناک سے خون کے بہنے سے خون کے دباؤ میں عارضی طور پر کمی ہونے لگتی ہے اور کچھ دیر کے لئے آرام ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑا خطرہ تو وہ اندرونی ضرب ہے جو عموماً دماغ پر لگتی ہے اور جس سے دماغ کی نسیں پھٹ جاتی ہیں، اسے ہم INTERNAL HAEMORRHAGE کہتے ہیں۔ دماغ کی نسیں یا شریانیں بہت ہی چھوٹی اور پیچ در پیچ ہوتی ہیں۔ ان کے پھٹ جانے سے یک طرفہ فالج ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ایسا ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ مریض کے اندرونی عناصر بالکل ناکارہ اور خطرناک صورت اختیار کر چکے ہیں ———

نہایت ہی خطرناک صورت :

سب سے پہلے ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ خون کا اعلیٰ دباؤ بذاتِ خود ایک بیماری نہیں بلکہ ایک علامت ہے، اور پھر اس اعلیٰ دباؤ کو کم کرنے کے لئے جب تک اس کے اصلی اسباب کا پتہ نہیں لگا لیا جاتا، کوئی علاج شفا بخش نہیں ہوگا، بلکہ اس کا اُلٹا اثر ہوکر ایک دوسری خطرناک صورت پیدا ہو جائے گی۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے یہ ہوتا رہا کہ خون کے اعلیٰ دباؤ کو کم کرنے کے لئے بعض قسم کی دوائیاں استعمال کی جاتی رہیں اور ان سے حقیقتاً خون کا دباؤ تو کم ہو جاتا، مگر اس کے نتائج بعد میں نہایت ہی خطرناک اور جان لیوا ہوتے۔ اب مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ آج کل اس قسم کے علاج کو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔

علاج باقاعدہ ایک کورس کی تحت ہونا چاہیئے اور اس میں مندرجہ ذیل باتوں کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔

کھانے پینے کی چیزوں میں خاص احتیاط سے کام لیا جائے کیوں کہ عام طور پر یہی وہ دو چیزیں ہیں، جن کے غلط استعمال سے خون کے دباؤ میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ مرغن اور ثقیل غذاؤں بالخصوص گوشت وغیرہ کا کثرت سے استعمال، چائے، کافی اور الکوہل کی کثرت نوشی، سخت نقصان دہ ہیں۔ ہائی بلڈ پریشر والوں کے لئے سبزی ترکاریاں اور ترش پھل زیادہ مفید ہیں۔ اور تازہ دودھ کی بنسبت دہی یا بہترین چھاچھ فائدہ پہنچاتی ہے۔ خون کے اعلیٰ دباؤ کی حالت میں گوشت کا استعمال بالکل ترک کر دینا چاہیئے۔

علاج کے شروع دنوں میں یہ بہت ہی فائدہ مند ہوگا کہ ہر ہفتہ میں ایک دن روزہ رکھا جائے۔ مریض کو جہاں تک ہوسکے مکمل آرام ہونا چاہیئے۔ کھانا پینا بالکل کم ہو اور پڑھنے، بات چیت کرنے یا سوچنے سے پرہیز کیا جائے۔

ایسی حالت میں جب کہ خون کا دباؤ حد سے زیادہ ہوگیا ہے تو اس وقت گرم پانی سے غسل کرنے سے دباؤ میں کمی پیدا ہونے لگتی ہے۔ مگر یہ کمی صرف عارضی طور پر ہوگی۔ کیوں کہ یہ ایک مستقل علاج نہیں ہے۔ ٹھنڈے پانی کا غسل خون کے دباؤ میں زیادتی پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا دورانِ علاج میں ٹھنڈے پانی سے ہرگز غسل نہ کیا جائے۔

ہائی بلڈ پریشر والوں کے لئے ورزش سے بھی ایک حد تک فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر یہ ورزش معتدل اور ہلکی پھلکی قسم کی ہونی چاہیئے۔ روزانہ مختصر سی پیدل سیر سے خون کا دباؤ درست ہونے لگتا ہے؛ اور چال ڈھال ٹھیک رہتی ہے۔ معدہ کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔

غصہ، رنج، خوف اور تلخ جذبات سے جہاں تک ہوسکے اپنے آپ کو دور رکھا جائے۔

۱۹۵۰ء میں میری کُل آمدنی چھ پونڈ ہوئی۔ پھر بھی لوگوں کا خیال ہے کہ مجھے یک لخت کامیابی ہوئی"

اُردو پڑھئے،
اُردو لکھئے،
اُردو بولئے۔

برنارڈ شا کی نو سال میں آمدنی

برطانیہ کا ۹۳ سالہ مشہور ادیب و ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شا اپنی ایک تازہ تصنیف "سولہ خود نوشت خاکے" کے دیباچہ میں لکھتا ہے، "لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ میں نے سوانح حیات کیوں نہیں لکھا۔ میرا جواب یہ ہے کہ جہاں تک میری زندگی اور آپ بیتی کا تعلق ہے، اس میں کوئی دلچسپی نہیں ملتی۔ میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی مجھے کسی عجیب واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ بڑھا ادیب برنارڈ شا ابھی تک اپنے مداحوں کے ساتھ مذاق کرنے سے نہیں ٹلتا۔ اپنی مخصوص طرز میں وہ رقمطراز ہے: "میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں دنیا کے اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ اشخاص میں سے ایک ہوں۔ اور کئی موقعوں پر ۹۵ فی صدی عالموں کو بدھو قرار دے چکا ہوں۔"

ان سولہ خاکوں میں شا کی ابتدائی زندگی کے تفریح پذیر واقعات —— آئرلینڈ میں بچپن، رشتہ داروں کی عجیب و غریب لفظی تصویریں، ڈبلن میں کلرکی کے تجربات، لندن میں ابتدائی جدوجہد، پبلک کے سامنے پہلی تقریر —— درج ہیں۔

پہلی ادبی کامیابی

ان میں سب سے زیادہ دلفریب منظر شا کی اس وقت کی زندگی کا ہے، جب وہ لندن میں رہا کرتا تھا۔ لکھتا ہے "میرا ایک مضمون قبول کر لیا گیا۔ معاوضہ مجھے ایک شلنگ ملا۔ ناشر نے مجھے چند پرانے بلاک دکھائے جو اس نے خریدے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ ان میں چند موزوں اشعار لکھ کر سکولوں کے لئے انعامی کتب چھاپی جائیں۔ میں نے اس کی خواہش کا مضحکہ چند اشعار میں اڑا کر اسے مذاق کی طور پر ارسال کر دیا۔ میں حیران رہ گیا جب اس نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے پانچ شلنگ معاوضہ دیا۔ میں متاثر ہوا۔ اور ایک اور تصویر کے لئے ایک سنجیدہ نظم لکھ کر بھیجی۔ اس نے اسے مسترد کر دیا اور میری شاعرانہ روش کا خاتمہ ہوگیا۔"

"ایک دفعہ مجھے پانچ پونڈ کا کام ملا، لیکن کسی ناشر یا ایڈیٹر کی طرف سے نہیں بلکہ ایک وکیل دوست کی طرف سے جو پیٹنٹ ادویات کے متعلق ایک طبی مضمون لکھوانا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں مجھے ناکامی ہوئی۔ چنانچہ نو سال *

افسانہ

اونٹ کی پیٹھ پر!

از فضل حق قریشی دہلوی

عموماً بہت سی باتیں مل کر انسان کو بامِ عروج پر پہنچاتی ہیں، لیکن کبھی کبھی ایک اور صرف ایک واقعہ اسے قعرِ ذلت میں دھکیل دیتا ہے۔ ممکن ہے، آپ یقین نہ کریں لیکن یہ ہے بالکل حقیقت۔ خود میں اس منزل سے گزر چکا ہوں۔

میں نے ایک غیر سرکاری سراغ رساں کی حیثیت سے کئی معاملات میں تفتیش شروع کی اور ان رازہائے سربستہ کو بے نقاب کیا جنکی گرد کو بھی خفیہ پولس کے افسرانِ اعلیٰ مشکل سے پہنچ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ملک بھر میں میری غیر معمولی قابلیت کی دھوم مچ گئی۔ اور جرائم پیشہ لوگ مجھے ختم کرنے کے لئے کی گھات میں رہنے لگے۔ اخبارات نے میری تعریف میں لمبے مقالے لکھے، نجی محفلوں میں میرا ذکرِ خیر ہونے لگا اور سرکاری دفتروں میں اچھے لوگوں کی فہرست میں میرا نام لکھ لیا گیا۔ سب کی متفقہ رائے تھی، کہ حسن یزدانی سے بہتر کوئی سراغ رساں ساری مملکت میں موجود نہیں ہے۔ محکمۂ پولیس نے تو باقاعدہ میری خدمات حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن میں نے ان کی پیش کش کو کسی عنوان قبول نہ کیا۔ میں آزاد منش انسان اصول و قواعد کا پابند ہو کر کوئی کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم میں نے اس بات کا اقرار کر لیا کہ جب کبھی اور جس معاملے میں بھی خفیہ پولیس کو میری ضرورت ہوگی، میں بے دریغ اپنی خدمات پیش کروں گا۔ اور اس کارِ خیر کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ چنانچہ ایک دو مرتبہ نہیں، مہینے میں بارہا اہم معاملات میرے سپرد کئے جاتے تھے۔ اور معمولی مسائل میں تو تقریباً روزانہ ہی مشورہ لیا جائے گا لیکن ایک روز۔

ہاں ایک روز میں رات کا کھانا کھا کر آرام کرنے کے لئے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر سنا، پولیس سپرنٹنڈنٹ میاں عبدالعزیز صاحب نے کہنا شروع کیا: "آج صبح کے وقت شہر کے مشہور سیٹھ ایوب صابر کو کسی نے ان کے دیوان خانے میں قتل کر دیا تھا۔ ان کی تجوری سے تمام نقد روپیہ اور زر و جواہر غائب ہیں۔ حادثہ کی اطلاع کے بعد سے اب تک میں اپنا مغز کھپا رہا ہوں۔ لیکن کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا۔ یزدانی صاحب خدا کے لئے آپ موقع واردات پر پہنچئے۔ اس اہم معاملہ میں آپکے مشورے کی سخت ضرورت ہوگی۔"

میں نے وعدہ کیا اور فوراً وہاں جانے کی تیاری شروع کر دی۔

سیٹھ ایوب صابر صنعتی اور تجارتی دنیا کے ان لوگوں میں سے تھے جو حکومت کے لئے بھی ایک مقناطیسی کشش رکھتے ہیں۔ ملک میں ایک دو نہیں کئی قسم کے کاروبار ان کے دم سے چل رہے تھے۔ کپڑے کے سب سے بڑے مل سے لیکر بیڑی بنانے کے کارخانے اور بسکٹوں کی فیکٹری تک بہت سے ادارے ان کی ذاتی ملکیت تھے یا ان میں وہ شریکِ کار تھے۔ بنکوں میں ان کی دولت کا شمار مشکل تھا۔ کیونکہ ملک کے کئی بڑے بنک انہی نے قائم کئے تھے۔

میں ان تمام چیزوں کو ساتھ لے کر جن کی تحقیق و تفتیش کے وقت خاص ضرورت پڑتی ہے۔ گھر سے نکلا تو صدر دروازے کے قریب ایک اجنبی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا اور مجھے لب کشائی کا موقع دئے بغیر کہنے لگا۔ "معاف کیجئے میرا نام حفظ الرحمٰن ہے۔ آپ سیٹھ ایوب صابر کے قاتل کا پتہ لگانے ان کے مکان پر تشریف لے جا رہے ہیں۔ وہاں تک پہنچنے کی زحمت نہ اٹھائیے۔ میں ان کا قاتل ہوں۔ مجھے گرفتار کر لیجئے۔ مجھے ان سے سخت نفرت تھی۔ انہوں نے تجارتی معاملات میں مجھے کئی بار دھوکہ دیا جس سے میرا دیوالہ نکلتے نکلتے رہ گیا۔ آخر موقع پاکر آج میں نے ان کو موت کی آغوش میں دھکیل دیا۔"

اور یہ کہکر اس نے اپنے طویل کوٹ کے بٹن کھول دئے نیچے کا تمام لباس خون میں لت پت ہو رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں" اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"میری آرزو ہے کہ اس معاملے میں بھی قاتل کا پتہ لگانے میں کامیابی کا سہرا آپ ہی کے سر رہے۔ بولئے آپ ہتھکڑی ابھی لگائیں گے یا ذرا تاخیر کر کے"

میں نے زور سے قہقہہ لگایا: "میرے نادان دوست تم ایک کچے اداکار ہو۔ اصلی قاتل نے مجھے غلط راستے پر لگانے کے لئے یہ چال چلی ہے۔ جو خون تمہارے کپڑوں پر لگا ہوا ہے وہ انسان کا نہیں بکرے کا ہے۔ اور اسکی چھینٹیں فطرتی طور پر نہیں پڑیں۔ بلکہ ارادتاً ڈالی گئی ہیں۔ میں اس قتل کے سلسلے میں تو نہیں۔ البتہ دھوکہ بازی اور حیلہ سازی کے تحت تم کو گرفتار کرا سکتا ہوں، لیکن فی الحال اسکی بھی فرصت نہیں ہے۔ جاؤ موج کرو۔ تم آسانی سے مجھے فریب نہیں دے سکتے۔"

یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ سڑک پر میرے سامنے سے ایک ٹیکسی گزرنے لگی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا اور اس میں بیٹھ کر سر مٹکاف روڈ کی طرف چلنے کے لئے کہا۔ میں نے راستے میں سوچا کہ معاملہ کسی قدر نازک ہے۔ ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا

میں نے منزلِ مقصود پر پہنچنے سے بیس پچیس گز پرے ہی موٹر کار کو ٹھہرا لیا۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا قرب و جوار کا جائزہ لے کر آگے بڑھوں۔ میں رکی ہوئی کار سے اترنے لگا تو شوفر نے مجھ سے پہلے ہی کار میں سے باہر نکل کر پستول کی نالی میری طرف بڑھا دی۔ اور کہا۔ آپ اس معاملے میں نہ پڑئیے ورنہ آپ کا تمام کھیل بگڑ کر خراب ہو جائے گا۔ میں سیٹھ ایوب کا قاتل ہوں۔ آپ عمر بھر کوشش کریں، تب بھی مجھے گرفتار نہیں کر سکیں گے۔ میں قتل کے الزامات میں کئی بار پھنس چکا ہوں مگر سزا ایک بار بھی نہیں ہوئی۔ میں ہمیشہ پولیس کو جل دے کر صاف بچ نکلا۔ خیریت اسی میں ہے کہ آپ اپنے ارادے سے باز آئیں۔ ورنہ یہ پستول ابھی آپ کی زندگی ختم کر دیگا۔"

میں نے ایک بار پھر زور سے قہقہہ لگایا اور کہا: "کارتوس کے بغیر صرف پٹاخے کی آواز دینے والا یہ پستول ان کی زندگی کو ختم نہیں کر سکتا۔ تم یہ فریب کسی اور کو دینا۔ ہم اڑتی چڑیا کے پر گن لینے والے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کیا اصلی اور نقلی پستول میں بھی امتیاز نہیں کر سکتے۔ میں جانتا ہوں کہ تم کس کے اشارے پر یہ کام کر رہے ہو۔ وہ شخص خود تم سے بھی زیادہ اناڑی معلوم ہوتا ہے۔" میں اسے حیرت و استعجاب میں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا لیکن معاً میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ سیٹھ کا قاتل اس دشت و جبل کا کوئی پرانا سیاح ہے۔ اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوگی۔

سیٹھ صاحب کے دیوان خانے پر پولیس سپرنٹنڈنٹ میاں عبدالعزیز نے میرا خیر مقدم کیا۔ اور ان کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ پولیس کے دوسرے ا

کچھ کم اہم نہیں تھے۔ میاں صاحب نے کہا۔ "یہ واردات اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی مشکل ہے۔ قاتل جان بوجھ کر علامات و اشارات چھوڑ گیا ہے اور ...."

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "تاکہ آپ غلط راہ پر چلیں اور قیامت تک قاتل کا پتہ نہ لگا سکیں؟"

میرے قہقہے کے ساتھ ہی ایک اور ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا میں نے پلٹ کر دیکھا کوئی شخص باغیچے کی جھاڑیوں سے بےہوش ہو جانے کے انداز میں درختوں کا جزو بن جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اسکی طرف توجہ نہ دیتا لیکن عبدالعزیز صاحب کے فوری اشارے پر ایک کانسٹیبل لپکا اور ذرا سے تعاقب کے بعد اس شخص کو پکڑ لایا۔ وہ سر سے پاؤں تک کپکپا رہا تھا اس کا لباس بھی خون میں لت پت تھا۔ انسپکٹر کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اجنبی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"میں تسلیم کرتا ہوں سیٹھ صاحب کو قتل تو میں نے کیا ہے۔ لیکن آپ سے جان کی امان چاہتا ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔ آئندہ ایسا جرم مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوگا۔"

"اچھا جاؤ۔ ہم نے تمہیں معاف کیا۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو بھگاتے ہوئے کہا۔

پولیس کے افسران میری اس حرکت پر سخت حیران تھے۔ میں نے غلط فہمی دور کرنے کے لئے ان سے کہا "آپ نے دیکھا نہیں اس کا لباس کتنا ڈھیلا ڈھالا اور غیر متناسب تھا۔ وہ خون میں لت پت کرنے کے بعد اسے پہنایا گیا تھا۔ یہ سب نرکے تھے اصل قاتل کے پھیلائے ہوئے ہیں ہمیں ان سے بچکر بازی کھیلنی پڑے گی۔"

"لیکن معاف کیجئے گا۔" میاں صاحب کی تسلی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اعتراض کے طور پر کہا۔ "ہمیں معاملے کی تحقیقات میں اس سے مدد مل سکتی تھی؟"

"ہاں، اس میں شک نہیں کہ ہم اس شخص کو حراست میں رکھ کر اور راز کی باتیں معلوم کرکے قاتل کا پتہ ذرا جلدی لگا لیتے لیکن اس طرح جستجو کی دلچسپی آدھی رہ جاتی، اور حقیقی لطف نصیب نہیں ہوتا۔ ممکن ہے، آپ کو میرے نظریے سے اتفاق نہ ہو کیوں کہ آپ پیشہ ور ہیں۔ اور میں صرف ذوق کی آسودگی کے لئے اس کوچے کی سیر کرتا ہوں اور پھر میں بات یہ بھی ہے، کہ میں کچے آدمیوں پر کبھی بھروسہ نہیں کرتا۔ بلکہ عموماً ان سے خالی الذہن ہو کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ صحیح طریقہ کار یہی ہے، کہ شہادات کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ خیر اندر چلیے؟"

دیوان خانے کے اندر داخل ہوتے ہوئے میں نے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بھی بتا دیا کہ میں اس سے قبل اسی واردات کے دو فرضی قاتلوں سے بھی مل چکا ہوں جن میں سے ایک مُصر تھا کہ میں اسے قید کرا دوں۔ اور دوسرا مار ڈالنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ لیکن میں نے ان کو نظر انداز کرتے ہوئے کوئی اہمیت نہیں دی۔

دیوان خانے کے اندر خواب گاہ میں ایک پلنگ پر سیٹھ ایوب صاحب کی لاش ایک سفید چادر سے ڈھکی رکھی تھی۔ کمرے کا کچھ سامان بے قاعدگی کی حالت میں پھیلا پڑا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ حادثے سے قبل چند لوگوں میں دھینگا مشتی ہوتی رہی ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ سیٹھ صاحب کے پلنگ کی چادر پر کوئی معمولی سلوٹ بھی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے ان کا کھیں اور قتل کرنے کے بعد اس پر لٹا دیا ہے۔ کمرے میں کسی اور جگہ خون کا معمولی دھبہ یا نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ نیز سیٹھ کے چہرے پر اتنا سکون اور اطمینان تھا کہ گویا وہ قدرتی موت مرے ہیں، عمداً مارے نہیں گئے ہیں۔

میں نے چاروں طرف نظر ڈال کر کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا لیکن میاں عبدالعزیز نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

"سیٹھ صاحب کی مسہری کے کٹہرے پر پن کے ذریعہ ایک کاغذ کا پرزہ لگا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا میں نے ذاتی منفعت کے خیال سے نہیں۔ صرف محبت کا انتقام لینے کی خاطر سیٹھ صاحب کو اس دنیا سے رخصت کیا ہے۔ کچھ دیر بعد میں بھی اس دار فانی سے کوچ کر جاؤں گی تاکہ ہم دونوں اگلی دنیا میں فوراً ایک دوسرے سے مل جائیں یعنی جو آرزو اس زندگی میں پوری نہ ہو سکی وہ اگلے جنم میں ممکن ہو جائے —" اور اس تحریر کے آخر میں سعیدہ لطیف کے دستخط تھے۔ سیٹھ صاحب کے شریک حیات کا کہنا ہے کہ میں اس عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ ملاقاتی کمرے میں ایک بار دیکھ چکی ہوں۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی کہ ان دونوں میں کوئی رشتۂ محبت قائم تھا یا اس کا امکان ہو سکتا تھا۔ ایک ماہر دستاویزات نے اس تحریر کا مطالعہ کرنے کے بعد رائے قائم کی ہے کہ وہ سرے سے عورت کے ہاتھ کا نمونہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ کسی مرد نے اردو تانیثی انداز تحریر اختیار کیا ہے۔ کاغذ کا ایک اور پرزہ سنگھار میز پر رکھا تھا۔ اس میں یہی لکھا ہوا تھا — میں خالد نسیم سیٹھ کے قاتل کا معاون و مددگار۔ اگر مجھ سے کچھ دریافت کرنا ہو۔ تو ۲۳۶۰ پر ٹیلیفون کیا جائے۔ چنانچہ میں نے فوراً مذکورہ نمبر پر ڈائل گھمایا گھنٹی بجی، دوسری جانب کسی نسوانی لہجہ میں کہا کہ میں ہوں سعیدہ لطیف۔ میں نے ابھی تک خودکشی نہیں کی ہے۔ کیوں کہ فی الحال اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ خالد نسیم صاحب کہاں ہیں۔ جواب ملا کہ وہ اعتراف جرم کرنے کے لئے کوتوالی گئے ہیں۔ میں نے فوراً کوتوالی کے انچارج سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ واقعی کوئی شخص خالد نسیم ملنے آیا تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے نام کا ملاقاتی کارڈ چھوڑ گیا ہے یزدانی صاحب اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ واقعات ایک معقول شخص کا دماغ خراب کر دینے کے لئے کافی نہیں ہیں؟"

"بے شک!" میں نے جواب دیا "بہت سی باتیں پریشان کن ہیں لیکن معاملہ اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا بنایا جا رہا ہے اسی لئے ہم کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا میرا خیال ہے اب رات زیادہ گزر چکی ہے۔ اس وقت لوگوں کے بیانات لینے مناسب نہیں صبح تک کیلئے اس معاملہ کو ملتوی کیا جائے۔

میں نے یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ ان پیچیدگیوں کے زیر اثر میں بھی میاں عبدالعزیز سے کچھ کم پریشان نہیں ہوں۔

تمام رات بے چینی میں بسر ہوئی۔ کبھی کروٹ اطمینان کی نیند نہ آسکی۔ کبھی غنودگی کا عالم طاری ہوا بھی تو خواب میں بہت سے مجرم قطار باندھے نظر آئے جن میں سے ہر شخص اس بات کا دعویدار تھا کہ سیٹھ کا قاتل صرف میں ہوں۔ باقی سب بکواس کرتے ہیں۔

آدھی رات کو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جھپٹ کر رسیور اٹھایا۔ انجان سے لب و لہجہ میں کسی نے مجھ کو مشورہ دیا۔ "دیکھئے سوچ سمجھ کر کام شروع کیجئے۔ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔ اگر آپ نے سیٹھ صاحب کو قتل کن امداد کی دولت پر [illegible] صاف کہ ایک ہی شخص کا کام تھا تو مجرم کو پکڑنے میں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔ یقین مانئے اس واردات میں حصہ لینے والے دو مختلف انسان ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ مختلف حادثات تقریباً ایک ہی وقت میں رونما ہوئے۔ حالانکہ انہوں نے کوئی مشترکہ [illegible] تیار نہیں کیا تھا۔"

اور اس سے قبل کہ میں خود کوئی سوال کرسکوں ٹیلیفون بند کردیا گیا۔ میں نے فوراً اسے ایکسچینج سے ملایا۔ آپریٹر لوگ دن کے وقت تو بہت مصروف رہتے ہیں لیکن آدھی رات کو جب اکثریت محو خواب ہوتی ہے۔ انہیں عموماً کوئی کام نہیں ہوتا۔ اور خبر اڑانے والے ملازموں کے لئے یہ معلوم کرلینا آسان ہو جاتا ہے کہ اس وقت کون کس سے بات چیت کررہا ہے۔ چنانچہ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ نمبر ۸۴۲۰ سے میرے ٹیلیفون پر گفتگو کی جارہی تھی۔ یہ وہی نمبر تھا جس کا حوالہ میاں عبدالعزیز نے اپنے بیان میں دیا تھا۔ ایک ہلکی سی کپکپی میرے تمام جسم پر طاری ہوگئی۔ اور موسم سرد ہونے کے باوجود پسینے کے چند قطرے میری پیشانی پر ڈھلک پڑے۔ میں نے ہمت کرکے ڈائل گھمایا۔ آٹھ۔ چار۔ دو اور صفر۔ گھنٹی بجی اور کسی نے نسوانی لب و لہجہ میں پوچھا "ہلو کون ہے۔ اور پھر خود ہی کہنا شروع کیا۔ میں ہوں سعیدہ لطیف۔ میں نے ابھی تک خودکشی نہیں کی۔ کیونکہ اپنا ارادہ ملتوی کردیا ہے۔ لیکن آپ بتایئے قاتل کا پتہ لگانے میں کچھ کامیابی نصیب ہوئی؟"

اس کے ساتھ ہی ایک نقرئی قہقہہ بلند ہوا اور ٹیلیفون بند کردیا گیا۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ مجھ پر کتنی عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ میں نے چاہا کہ اپنے شہر سے بھاگ کر کہیں دور چلا جاؤں اور جب تک اس معاملہ کا فیصلہ ہو جائے واپس نہ آؤں۔

دوسرے روز علی الصبح اخبار بیچنے والوں کی آواز سنائی دی۔ سیٹھ کے سنسنی خیز قتل کی خبر جلی عنوان بنی ہوئی تھی اور یہی ہر اخبار فروش کی زبان پر تھا میں نے ایک پرچہ منگوایا۔ روئیداد میں میرا بھی ذکر تھا۔ توقع ظاہر کی گئی تھی کہ قاتل کا پتہ بہت جلد لگ جائیگا میں منہ ہاتھ دھو کر اور ناشتے سے فارغ ہو کر سیٹھ صاحب کے دیوان خانے پر پہنچا تو میاں عبدالعزیز پہلے سے موجود تھے۔ جیسے رات بھر روتے رہے ہوں۔ ان کی آنکھوں کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ بھی رات کو بالکل نہیں سو سکے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے نشانات انگشت کی جو تصویریں بنائی ہیں ان کی جانچ پڑتال میں سرگرداں رہا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

"خیر کوئی بات نہیں" میں نے کچھ ایسے انداز سے کہا جیسے میں اس معاملے کی الجھنوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دے رہا ہوں گھر کے دو چار ملازموں کو بلایئے شاید ان سے کوئی مفید بات معلوم ہو سکے۔

"ہاں ضرور ضرور" میاں صاحب بولے جیسے وہ اسی انتظار میں تھے۔ میں نے کئی بار سوچا ان کا بیان قلمبند کروں مگر آپ کی غیر موجودگی کی وجہ سے خاموش رہا انہوں نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا اور کچھ دیر میں گھر کے ملازم آنے شروع ہوگئے۔ سب سے پہلے بوڑھے دربان نے جو صدر دروازے پر چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اپنا افسوس کرتے ہوئے کہا حضور اس میں بہت بڑا قصور میرا ہے۔ میں نے قاتلوں کی پوری جماعت کو اندر جانے کی اجازت دیدی۔ حالانکہ وہ وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ قبل آگئے تھے۔

"کیا مطلب" میں نے حیران و متعجب ہو کر پوچھا۔ کیا ان لوگوں نے سیٹھ صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے کوئی وقت ان سے لیا تھا؟

جی نہیں۔ دربان کی بجائے باورچی بول پڑا۔ انہوں نے ایک روز پہلے دربان سے کہا کہ اگر ہم تمہارے سیٹھ صاحب کو جان سے مار ڈالنا چاہیں تو اس کام کے لئے سب سے زیادہ مناسب وقت کونسا ہے؟ اس پر دربان نے جواب دیا کہ صبح آٹھ بجے آجاؤ۔ تمہارا دلی منشا پورا ہو جائے گا۔

لیکن حضور، دربان نے اپنی صفائی پیش کی "میں نے آٹھ بجے کا وقت اسی لئے مقرر کیا تھا کہ سیٹھ صاحب روزانہ ساڑھے سات بجے گھر سے چلے جانے کے عادی تھے۔ لیکن کل وہ خلاف معمول آٹھ بجے تک پڑے سوتے رہے۔ جیسے اپنی موت کا خود انتظار کررہے ہوں جبھی تو قاتلوں کو موقع مل گیا۔ اب آپ ہی بتایئے اس میں میرا کیا قصور ہے"

"قصور ہے کیوں نہیں"۔ کاہدار نے فوراً آگے بڑھکر گویا تردید کی۔ جب تم نے مجھ سے مشورہ لیا تو میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ لوگ وقت کی پابندی ہرگز نہیں کریں گے اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ دیر میں آنے کی بجائے ضرور وقت سے پہلے آئیں گے۔ آخر ہم بھی تھوڑا بہت تجربہ رکھتے ہیں"

"بھگوان کی قسم" بھنگی نے کہنا شروع کیا میں دیوان خانے میں ان کے داخل ہو جانے کے بعد موری صاف کرنے کا بانس لئے تیار کھڑا رہا کہ جونہی وہ سیٹھ صاحب کو قتل کرکے باہر نکلیں میں بھی ان کا سر توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردوں۔ لیکن جب وہ برآمد ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ ایسی صورت میں بھلا میں کیا کرسکتا تھا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ یوں تو میں بھی دس نمبر کا بدمعاش رہ چکا ہوں۔ ابھی پچھلے سال تک میرے نام کی آواز پڑتی تھی لیکن پستول کے مقابلے میں بانس کیا کام دے سکتا تھا۔

"مجھے دیکھئے حضور!" میں بھی جب سے خدا کی دنیا میں کوئی معمولی انسان نہیں ہوں۔ قتل کے تین مقدمات میں ماخوذ ہوا اور ہمیشہ صاف بچ گیا۔ آزاد نگر کی پولیس میرے نام سے کپکپاتی تھی۔ لوگ میرے ذکر سے اپنے روتے ہوئے بچوں کو ڈرا کر چپ کردیتے تھے۔ اب وہ پیشہ چھوڑ کر مالی گیری شروع کردی ہے۔ تاہم وہ پرانے ہتھکنڈے تو اب تک یاد ہیں پرسوں شام کو قاتلوں کی جماعت میں سے دو آدمیوں نے باغیچے کی جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر مکان کا جائزہ لیا۔ تو میں سمجھ گیا کہ یہ سیٹھ صاحب کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کی کارگزاریوں کا کمال دیکھنے کے لئے خاموش رہا اور حقیقتاً تسلیم کرتا ہوں کہ وہ سب اپنے فن کے ماہر ہیں۔ انہوں نے سیٹھ صاحب کو ختم کرنے کے بعد ایسی صورتیں پیدا کردیں کہ تفتیش کرنے کے سلسلے میں بڑے سے بڑے سراغرساں کا دماغ خراب ہو سکتا ہے اور اس میں کیا شک ہے۔ کہ میرا دماغ واقعی خراب ہو چلا تھا۔ اور مجھ سے زیادہ خراب حالت میاں عبدالعزیز کی تھی۔ وہ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ سیٹھ کے ملازموں سے اپنی عادت کے مطابق جرح بھی شروع نہ کرسکے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ تاکہ ہم دونوں علیحدگی میں تبادلۂ خیالات کرسکیں۔ لیکن تنہائی کے باوجود ہم ایک دوسرے کو مخاطب نہ کرسکے بلکہ ایک دوسرے کے سامنے چپ چاپ بیٹھے کمرے کی خاموش فضا میں کسی نامعلوم چیز کی تلاش کرتے رہے۔

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ کچھ دیر بجتی رہی اور پھر رک گئی۔ ہم دونوں میں سے کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی۔ کہ رسیور اٹھا کر سنتا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دوبارہ بجنا شروع کیا اور اب مجبوراً توجہ دینی پڑی ٹیلیفون پر کہا گیا میں نمبر ۸۴۲۰ سے بول رہا ہوں۔ میرا نام خالد نسیم ہے۔ سعیدہ لطیف نے ابھی تک خودکشی نہیں کی ہے۔ کیونکہ میری خاطر انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے آج دوپہر کو سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں ہماری سول میرج ہو رہی ہے۔ آپ سے استدعا ہے کہ اس تقریب میں ضرور شریک ہوں سعیدہ نے خاص طور پر تاکید کی ہے"

ٹیلیفون بند ہوگیا میں نے ڈائرکٹری دیکھکر یہ معلوم کرنا چاہا کہ فون نمبر ۸۴۲۰ کس عمارت میں لگا ہوا ہے۔ لیکن کچھ پتہ نہ مل سکا۔ ایکسچینج سے دریافت کیا تو جواب ملا کہ شہر بھر میں اس نمبر کا کوئی ٹیلیفون نہیں۔ بلکہ کوئی نمبر آٹھ ہزار سے شروع ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ گذشتہ شب وہیں سے اس نمبر کی تصدیق ہو چکی تھی اور خود میں بھی اسے ایک بار ملا چکا تھا۔

(بقیہ مضمون صفحہ ... کالم ... پر ملاحظہ ہو)

مرزا داغ اور نفسیاتِ محبوب

کسی تصنیف یا تالیف کے متعلق کسی تنقید نگار کا یہ حکم لگا دینا کہ وہ قطعی طور سے اخلاق انسانی اور سوسائٹی کے بنیادی اصولوں کے لئے سخت تباہ کن ہے۔ اور یہ کہ اس قسم کی تصنیف و تالیف تمدن انسانی اور معاشرت حیات کیلئے ایک زہریلی چیز ہے، ہمارے خیال میں ایک شدید غلطی ہے، جسے تنقید نگاری کی ایک طفلانہ جسارت سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ بہت سی اچھی تصانیف محض اس غلط اصول تنقید کی نذر ہو گئیں۔ اور آج ان کا نشان تک نہیں ملتا۔ تواریخ عالم میں اس قسم کی تباہی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ آنے والی نسلیں اسلاف کی ان فروگذاشتوں کو معاف کر نہیں سکتیں۔ کیونکہ ان کی یہ تنگ نظری کسی نہ کسی مخصوص فن یا علم و ہنر کی معراج کو تباہ کرنے کا باعث بن چکی ہے۔

ایک صحیح ناقد فن کا تو یہ فرض ہونا چاہئیے۔ کہ وہ جس قسم کی تصنیف و تالیف پر اپنے قلم کو جنبش دے رہا ہے۔ دنیا کو بتا دے، کہ وہ تصنیف یا تالیف اپنے موضوع فن کے لحاظ سے کہاں تک کامیاب یا ناکامیاب ثابت ہو سکتی ہے، اور یہ کہ وہ کس زمانہ اور کس ماحول میں لکھی گئی ہے۔ اس کے مصنف نے نوعیت فن اور زیر بحث مسئلہ پر کس قدرت یا عدم قدرت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، وہ صرف اپنی مخصوص یا موضوعی حد میں کس درجہ تک کامیاب و ناکامیاب ہے۔ ایک سائنس داں کی کتاب میں شاعری کے نکات تلاش کرنا فعل عبث ہے۔ بالکل اسی طرح ایک شاعر کے کلام میں علم ہندسہ کے موضوعات کی تفتیش بیکار سی بات ہے۔

ہر تصنیف میں اس کی نوعیت فن اور موضوع کے ماتحت بھلائی یا برائی کی تلاش ہونی چاہئیے۔ تاکہ تنقید نگار کا فیصلہ اہل علم کی نظروں میں قابل وقعت قرار دیا جا سکے۔

اسی مختصر تمہید کے بعد ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ کہ مرزا داغ دہلوی ہندوستان کے اردو شعراء میں صرف ایک غزل گو شاعر ہیں۔ دیگر اصناف سخن میں ان کا کلام وہ پایہ نہیں رکھتا، جیسا کہ غزل میں، ان کی تمام کوششیں صرف اسی عمارت کی تکمیل کے لئے صرف ہوئیں۔ ان کا زبردست کارنامہ صرف غزل ہے، اب تنقید نگار کا فرض ہے۔ کہ مرزا داغ کے متعلق ان کی اس خصوصیت کا لحاظ ہر حال میں رکھے۔ اور جب اپنے قلم کو جنبش دے، تو صرف ان کو ایک متغزل شاعر کی حیثیت سے پیش کرے اور ساتھ ہی اس لئے اگر موازنہ کی ضرورت سمجھے۔ تو صرف ان لوگوں کو ان کے مقابل لائے جو اصولی اور اساسی طور پر ان کے مد مقابل قرار دئے جا سکتے ہیں۔ داغ کے ساتھ انیس کا ذکر کر دینا صحیح نہیں۔ یا یہ کہ ان کے کلام میں تصوف اور فلسفہ کی پیچیدگیاں تلاش کرنے کی کوشش کیا جائے۔ یقیناً یہ انتہا درجہ کی بد مذاقی ہوگی۔

داغ کے کلام میں صرف تغزل اور اس کے لوازمات ملحقہ ہی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ ہم افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ اگر مومن یا اور کسی ایسے ہی شاعر کے متعلق جب کچھ لکھا جاتا ہے۔ تو یہاں تک کہہ دیا جاتا ہے، کہ شاعری صرف تغزل ہی تک محدود ہے اور یہی ایک چیز ہے جہاں پہنچ کر انسان سوز و گداز کی دنیا میں ڈوب کر خدا جانے کیا سے کیا بن جاتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں جب مرزا داغ کا نام آتا ہے، تو اکثر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، اور آسانی سے اپنا یہ آخری فیصلہ صادر کر دیتے ہیں، کہ داغ کی شاعری ذطعاً غیر لقہ ہے۔ وہاں سوائے رندیت اور ہوس ناکی کے اور کچھ نہیں، چند بازاری خیال ہیں، افسوس، تعجب ہے، کہ دوسروں کے یہاں یہی بازاری باتیں متین تغزل سمجھی جاتی ہیں۔ مگر داغ کے یہاں کچھ اور خیال کری جاتی ہیں۔ مثلاً مولانا نیاز فتحپوری۔ مومن کے متعلق لکھتے ہیں :-

"دوسری خصوصیت جو مومن کو دیگر ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے۔ کہ رنگ تغزل میں ان کا کلام اس غیر تغزلانہ چیز سے بالکل پاک ہے جسکو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ خود بھی کہتے ہیں ؎

مومن بہشت و عشق حقیقی نہیں نصیب
ہم کو تو رنج ہو، جو غم جاوداں نہ ہو!

بظاہر یہ امر کچھ چونکا دینے والا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کا کلام تصوف کی چاشنی سے خالی نظر آئے۔ لیکن اگر ایک نقاد غزل کو غزل ہی کے نقطہ نظر سے دیکھے گا۔ تو وہ یوں بھی تصوف کے کلام کو خارج کر دے گا۔ کیونکہ غزل کے اندر ایسی باتوں کا اظہار جو تغزل سے علحدہ ہوں، میرے نزدیک کوئی محمود بات نہیں ہے"

مولانا نیاز کا نظریہ یہ ہے۔ کہ ایک غزل گو شاعر کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے کلام میں غیر متغزلانہ چیزیں یعنی تصوف و فلسفہ کو داخل نہ کرے ورنہ وہ ایک صحیح نقاد کی نظر میں غزل گو کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ لیکن اگر مولانا نیاز سے داغ کے حق میں یہی فتویٰ طلب کیا جائے۔ جو انہوں نے مومن اور ان کی شاعری کے لئے صادر فرمایا ہے۔ تو غالباً وہ داغ کے معاملہ میں تامل نظر آئیں گے۔ حالانکہ ان کا یہ فتویٰ مومن سے زیادہ داغ کے حق میں صحیح ہے۔ کیونکہ آپ غزل میں غیر متغزلانہ عنصر پسند نہیں کرتے۔ اور اردو شعراء میں سب سے زیادہ یہ چیز داغ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ ان کے یہاں بعض، اشعار پست ہیں سو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ایسی فروگذاشتوں سے کسی شاعر کا کلام بچا ہوا نہیں۔ نرم گرم پہلو سب کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ غالب سب سے زیادہ متین اور سنجیدہ خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ شعر ان کے دیوان میں موجود ہے ؎

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ؛
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایکدن

دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ شاعر کا زیادہ تر منتخب کلام اسی کے موضوع فن کے ماتحت اساسی طور پر بلند ہے یا نہیں۔ میر تقی کا بہت سا کلام پست ہے۔ لیکن اس کمی سے ان کے بلند رتبہ، کلام کی خصوصیت ذرہ کم نہیں ہو سکتی ——— پھر داغ کے یہاں اگر دو چار شعر غیر ثقہ نظر آتے ہیں۔ تو اس کمی سے ان کے تمام بہتر کلام کی خصوصیت کیونکر زائل ہو سکتی ہے۔

ایک مسلسل غلطی !

شعرائے اردو کی تاریخ حیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہر دور میں ایک جماعت کا خیال قطعی طور پر شعراء کے باہمی موازنہ کی طرف مبذول رہا ہے۔ چنانچہ اس خیال نے شعراء کی تاریخ میں چند شاعروں کو ایک دوسرے کا مستقل طور پر حریف قرار دیکر ایک نئی قسم کی آویزش قائم کر دی، بلاشبہ

یہ ایک غلطی تھی، جس نے شعراء کی امتیازی حدود کو توڑ کر غلط بحث کی ایک گہری خلیج قائم کر دی۔ اور بعض تعلیم یافتہ حضرات نے سمجھ لیا کہ در حقیقت میر و سودا، مصحفی و انشاء، آتش و ناسخ، غالب و ذوق اور داغ و امیر آپس میں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں جس قدر تحریریں سپرد قلم کی گئیں، ان سب میں یہ خیال برابر کارفرما ہے۔ اور آج یہ بحث ایک مستقل عنوان رکھتی ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں متذکرہ بالا شعراء بلحاظ موضوع سخن ایک دوسرے کے حریف قرار نہیں دیے جا سکتے۔ ان سب میں ہر ایک کی جداگانہ راہ ہے۔ اور کوئی خصوصیت بھی کسی ایک میں ایسی نہیں پائی جاتی جو اس کے مفروضہ مد مقابل میں بھی پائی جاتی ہو۔ یعنی ایک مستقل کیفیت شاعرانہ کلیۃً دونوں میں مشترک موجود نہیں ہے، چونکہ یہ بحث ایک علیحدہ عنوان چاہتی ہے۔ اس لئے فی الحال ہم اس پر کچھ نہ لکھیں گے۔ البتہ یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ کہ ہم کسی طرح بھی امیر و داغ کو آپس میں ایک دوسرے کا حریف تسلیم نہیں کرتے، ہمارے خیال میں دونوں کی راہ الگ الگ ہے، اکثر حضرات نے دونوں استادوں کے دواوین سے ہم طرحی غزلیں انتخاب کر کے موازنہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے، کہ یہ دونوں باہم حریف ہیں۔ لیکن ہم کو اس سے سخت اختلاف ہے

امیر مینائی

حقیقت یہ ہے کہ امیر مینائی کی شاعری لکھنؤ کے مخصوص رنگ سے کسی حال میں بھی جدا نہیں کی جا سکتی۔ ان کا کلام تمام و کمال اسی ایک اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ جدید کلام کو بھی کلیتہً اس رنگ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ صرف بعض غزلیں ایسی ہیں، جن کو تمام عمر کا کفارہ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً :-

عالم شگفتہ ہو جو میں آفت رسیدہ ہوں
صبح بہار ہو جو گریباں دریدہ ہوں!
مطلب کی سمت رخ ہے مراد و رسیدہ ہوں!
گویا قصیدہ میں، میں گریز قصیدہ ہوں
میں اور حرم ہیں پیر مغاں وہ ترے مرید!
لیکن وہ بدعقیدہ ہے میں خوش عقیدہ ہوں
اے اہل بزم مجھکو اٹھا دو نہ بزم سے!
شمع سحر ہوں عمر بہ پایاں رسیدہ ہوں
شبنم کہاں امیر ملے ہیں مجھے نصیب
گل بن کے چمن میں جو میں آب دیدہ ہوں

اور سامان جنوں ہیں مجھے درکار نہیں
کوئی نشتر کوئی سا ناکوئی چھالا ہوتا!

★

بڑے مزے سے گذرتی ہے بیخودی میں امیر
وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں!

یہ آخری زمانہ کا کلام ہے، جبکہ منشی صاحب مرحوم کو، داغ کی تقلید کا خیال پیدا ہوا لیکن ایسی مثالیں ان کے یہاں خال خال ہیں۔ جن پر "الشاذ کالمعدوم" صادق آتا ہے

مرزا داغ ایک دوسری منزل کے رہ سپار ہیں۔ ان کو لکھنؤ کے مخصوص رنگ کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ حتی کہ اپنے مخصوص انداز میں استاد ذوق سے بھی کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ ذوق کی تمام شاعری ناسخ لکھنوی کی آواز بازگشت ہے۔ تشبیہ استعارات کی بے اعتدالی اور لفظی رعایتیں کسی طرح ناسخ لکھنوی کی آواز بازگشت ہے۔ تشبیہ، استعارات کی بے اعتدالی اور لفظی رعایتیں کس طرح ناسخ سے کم نہیں۔ ہم بلا خوف و تردید کہتے ہیں۔ کہ دہلی کے تمام شعراء میں صرف ذوق ہی ایک ایسے شخص ہیں جنہوں نے لکھنؤ کی تقلید میں اپنی شاعری کی بنیاد غلط اصول پر قائم کر کے متقدمین کے صحیح طریقے سے دور جا پڑے۔ ان کے کلام میں رنگ میر کی جھلک بھی نہیں پائی جاتی لیکن داغ کی شاعری آتش و غالب کے سنجیدہ تغزل کی رہین منت ہے۔

داغ نے ان دونوں استادوں کے انداز سخن میں ایک نئے پہلو یعنی "طعن و تشنیع" اور شوخی و تیکھا پن کا، گہرا رنگ پیدا کر کے صفائی زبان کی چاشنی دیکر گلزار سخن میں نئے پھول کھلائے ہیں، زبان کو اس قدر صاف کیا ہے کہ شاید و باید الفاظ کی نزاکت مضامین کی خوبی اور خوش اسلوبی سے ہر جگہ دست و گریباں ہو کر رہ گئی ہے۔ جو جو واردات عشق مجازی میں ہوس پیشہ لوگوں کو پیش آتی ہیں۔ داغ ایک ایک کر کے ان کا ماہر ہے۔ حسن و عشق کی پوشیدہ کیفیتوں اور حالتوں کو واقعہ نگارانہ انداز میں ایسی خوش اسلوبی سے بیان کرتا ہے۔ کہ سننے والے پر وہی سماں چھا جاتا ہے۔ بلا شبہ اس کا "محبوب" بے پردہ محبوب ہے، جس سے ملاقات و اتحاد ناممکن نہیں، اسی لئے بھی نفسیات محبوب پر مرزا داغ نے جس خوبی سے لکھا ہے، اردو شاعری میں، اس کا جواب نہیں۔

قبل اس کے کہ ہم اپنے موضوع سخن پر بحث کریں۔ مناسب سمجھتے ہیں کہ تغزل کے متعلق عربی علم و ادب کا نظریہ قارئین کرام کے سامنے مختصر طور پر پیش کر دیں کہ آسانی سے تغزل کی حقیقت واضح ہو جائے۔ اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ داغ کی شاعری کو اس موضوع سے کس قدر قرب ہے۔

عربی علم ادب اور تغزل

ابن رشیق اور ابن ورامتہ نے غزل کی حقیقت سمجھاتے ہوئے کہا ہے۔ کہ

"غزل میں عشق و محبت کے نفسیاتی دلائل نہایت قوی ہونے چاہئیں اور سوز و گداز جذب و اضطراب کی صحیح شہادتیں فطری اصول کے ماتحت پائی جائیں۔ عام طور پر عاشق کی طرف سے ایسے خیالات کا اظہار کیا جائے جن میں عجز و نیاز، رقت و خاکساری کا عنصر غالب ہو سختی اور درشتی بالکل نہ ہو۔ حتی کہ حمیت و خودداری کے جذبہ کا اظہار بھی بہت کم پایا جائے۔"

جہاں تک ہو غزل میں ایسی باتیں پائی جائیں۔ جن میں عجز و نیاز اور خاکساری کا اظہار کثرت سے ہو۔

(جناب مولوی محمد اسحٰق صاحب آلم مظفرگری)

دولت کے دو رخ!

تقدیر کی رو، وقت کی رفتار، ہے دولت
راحت کی سحر، غم کی شب تار، ہے دولت
طوفان نشاط، ابر اجل بار، ہے دولت
فردوس طرب، دوزخ افکار، ہے دولت

امید بھی ہے یاس بھی، نیکی بھی، بدی بھی
یہ روح کی ظلمت بھی ہے حسن ابدی بھی!

آغا حشر کاشمیری

★

طامس گاریگ میزاریک

از: نریش کمار شاد

یہ محب وطن اور اپنی سرزمین کا مشہور عالم ۷ مارچ ۱۸۵۰ء کو "موراویہ" میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک غریب کوچوان تھا۔ چنانچہ میزاریک کی ابتدائی زندگی بھوک اور پیاس کے لرزہ خیز حادثوں اور صدموں میں گزری۔ لیکن ان مشکلات نے آئندہ زندگی کو سنوارنے میں اسکی بہت امداد کی اور میزاریک نے بچپن ہی میں محسوس کر لیا کہ زندہ رہنے کے لئے مسلسل کشمکش اور متواتر جدوجہد کی سخت ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دس بارہ سال کی عمر ہی میں معاشی زندگی میں اپنے والدین کا ہاتھ بٹانے کے لئے لوہار کا کام سیکھ لیا۔ اور کتنے ہی سال تک اس ذریعۂ معاش سے اپنا اور اپنے ماں باپ کا پیٹ پالتا رہا۔ لیکن وہ اس دور ابتلا میں بھی اپنی تعلیم سے غافل نہیں رہا۔ انتہائی ناموافق حالات کے باوجود اس نے مطالعہ جاری رکھا۔ اور آخر [illegible] سال کی عمر میں "وائنا" اور "لائپزیگ" کی [illegible] بے مثال [illegible] کی ان تھک کوششوں اور فطری صلاحیتوں کے [illegible] ثبوت سندوں کی صورت میں حاصل کئے۔ ان یونیورسٹیوں کے کڑے امتحانوں سے کامیاب ہونے کے بعد اسے ایک مدرسے میں معلم کی ملازمت مل گئی۔ لیکن اس کے بعد بھی میزاریک نے اعلیٰ تعلیم کو حاصل کرنے کے لئے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ حتیٰ کہ ۱۸۸۲ء میں اسکی غیر معمولی قابلیت اور نکتہ سنجی کی شہرت اسے مدرسے سے نکال کر "چیکوسلاویکیہ" کے دارالحکومت "پراگ" میں لے آئی۔ اور یہاں وہ پراگ یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔

میزاریک کی طبیعت دراصل شروع ہی سے سیاسیات کی طرف ہی مائل تھی۔ لیکن حالات کی ناسازگاری اسے اس میدان میں آنے سے روکتی تھی۔ پراگ یونیورسٹی میں آتے ہی اس نے سیاسی فضا کو بھی اپنانا شروع کر دیا۔ چونکہ میزاریک کے سیاسی نظریات ٹھوس اور سلجھے ہوئے تھے۔ اور ان پر عوام کی پسندیدگی اور مقبولیت کی مہر ثبت تھی۔ اس لئے اس کی شخصیت علمی اور ادبی حلقوں کی طرح سیاسی حلقوں پر بھی چھا گئی اور ۱۸۹۱ء میں وہ پہلی بار آسٹریلیا کی پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں اسے دوسری دفعہ پھر اسی عہدے کے لئے منتخب کیا گیا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں آسٹریلیا نے جرمنی کا ساتھ دیتے ہوئے سرویہ پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کے ہوتے ہی اتحادیوں نے آسٹریلیا کے مختلف صوبوں میں مختلف سیاسی جماعتوں اور قوموں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ان ایام میں میزاریک لندن کے کنگس کالج میں لیکچرار تھا۔ جو طلباء کو علم اور ادب کی قدروں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں سیاسیات کے نئے تقاضوں سے بھی روشناس کر رہا تھا اور رفتہ رفتہ ان کے ذہنوں میں آزادی کی تحریک کی بنیادیں استوار کرتا جا رہا تھا۔ یہ میزاریک کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ آسٹریا کی چیک اور سلاوی رعایا باغی ہو گئی اور پھر اس نے ہی چار مضبوط لشکروں کی تنظیم کرنے کے بعد اتحادیوں کی طرف سے جنگ کی۔

۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد جب ملک کو آزادی نصیب ہوئی تو چیکوسلاویکیہ کے نام سے ایک جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔ اور اس میں بوہیمیہ، موراویہ، سلیشیہ، سلاویکیہ اور روتھینیہ کے ممالک بھی شامل ہو گئے۔ جو جنگ عظیم سے پہلے آسٹریا یا ہنگری کے ساتھ تھے۔

۱۹۲۰ء کے آئین کی رو سے چیکوسلاویکیہ آئینی طور پر بھی ڈیموکریٹک جمہوریہ بن گیا جس پر ایک صدر حکومت کرتا ہے اور جس کا انتخاب سات سال کے لئے ہوتا ہے چنانچہ سب سے پہلا صدر جنتا کا محبوب رہنما یہی میزاریک ہی چنا گیا ۱۹۲۷ء میں سات سال کے بعد جب حسب دستور دوسری مرتبہ انتخاب ہوا۔ تو بھی میزاریک ہی کو صدر بننے کا شرف بخشا گیا۔ لیکن اس دوران میں میزاریک عمر کی اسی منزلیں طے کر چکا تھا۔ اور اس نے خود ہی محسوس کیا کہ اس پیرانہ سالی میں سلطنت کا اہم کام بطرز احسن سرانجام نہیں دے سکتا چنانچہ ۱۹۳۵ء میں اس نے استعفٰے دے دیا۔ اور اپنی جگہ ڈاکٹر بینیش کا نام تجویز کیا جو بعد میں منتخب بھی ہو گیا۔

۱۴ ستمبر ۱۹۳۷ء کو ستاسی سال کی عمر میں یہ عوام دوست لیڈر، جمہوریت کا سچا وفادار اور اپنے وطن کا عظیم المرتبت رہبر ہمیشہ کے لئے اپنے ملک کو داغ مفارقت دے گیا۔

میزاریک کے انتقال کے بعد پراگ کے میوزیم میں خاص طور پر ایک ایسے شعبہ کی طرح ڈالی گئی جس میں میزاریک کے متعلق تمام قوم کے اخباروں اور مضمونوں کی تحریریں ابھی تک محفوظ ہیں۔ یورپ والے اسے اب بھی "گرینڈ اولڈ مین آف یورپ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ میزاریک ایک زبردست فلسفی، بے پناہ عالم اور کامیاب لیڈر تھا۔ اس سرگرمی اور محنت جانی سے اس نے علم و ادب کی خدمت کی اور جس قدر مقبولیت اور ہر دلعزیزی اسے اپنے ملک کے عوام میں حاصل ہوئی اسکی مثال ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ میزاریک کی سب سے بڑی خصوصیت اسکی انسان دوستی اور ملکی حمیت تھی۔ اس کے علاوہ اسے پروپیگنڈے کے فن میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کچھ اصول وضع کر رکھے تھے جن سے اس کے سیاسی شعور کی گہرائی اور مصلحت اندیشی کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے:

آسٹریلیا کے جرمن باشندوں کے خلاف کوئی الزام نہ تراشا جائے۔

واقعات کو الٹ پھیر کر یا مبالغہ آمیزی کے ساتھ نہ پیش کرے۔

ایسا وعدہ کبھی نہ کیا جائے جسکی تکمیل ناممکن ہو۔

اتحادی مدبروں کے سامنے کبھی منت سماجت کیلئے نہ جایا جائے۔

ہمیشہ ذاتی غرض اور اپنی شخصیت کو نظر انداز کر کے ٹھوس دلائل سے کام لیا جائے۔

اپنی قوم کے سوا کسی دوسرے سے روپیہ نہ لیا جائے۔ خواہ وہ کتنی ہی صدق دلی سے پیش کریں۔

جن لوگوں سے بظاہر یا براہ راست ہمیں کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں بھی اپنا حامی بنانے کی کوشش کی جائے۔

یہ کس قیامت کی بےکسی ہے نہ میں ہی اپنا نہ یار میرا
نہ خاطر بیقرار میری نہ دیدۂ اشکبار میرا

Nauroz

(Urdu Weekly)

سرپرست

عالیجناب

سید عبدالرحمن صاحب

بی اے ایل ایل بی (علیگ) ایم ایل سی

ایم سی اے

روز یکشنبہ ۴ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء

ایڈیٹر

خواجہ غلام محی الدین

بی ایس سی

قیمت

چار آنے